



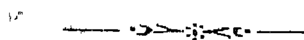
# تنویرادب

یعنی

## تاریخ زبان وادب اُردو

از

صغیر احمد جان، ایم۔ اے



مطبوعہ
نیشنل پریس الہ آباد
۱۹۳۷ء



# عرض حال

## منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

تاریخ زبان و ادب اُردو کی ضرورت جس قدر مجھے زمانۂ طالب علمی میں محسوس ہوتی تھی، اُس سے زیادہ زمانۂ معلّمی میں محسوس ہوئی۔ ہمیشہ ایسی تاریخ کی جستجو رہی جو مختصر بھی ہو اور مکمل بھی جس میں بقدر ضرورت تاریخی معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہوں اور تنقید بھی مذاق و معیار حال کے مطابق ہو۔

اِس وقت اُردو میں متعدد تاریخیں موجود ہیں اور بعض اُن میں سے اپنی گوناگوں ادبی دلچسپیوں کے باعث حیاتِ ابدی حاصل کر چکی ہیں مگر طلبہ کے نقطۂ نظر سے اُن میں کسی نہ کسی بات کی کمی ضرور ہے۔ وہ یا تو ضرورت سے زیادہ ضخیم ہیں یا اُن کی معلومات زمانۂ حال کی تحقیق کا ساتھ نہیں دیتیں اور یہ نقص تو عام ہے کہ تنقید زیادہ تر لفظی ہوتی ہے مختلف شعراء اور مختلف ادوار کی شاعری کا اساسی فرق اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتا۔ اور اُردو زبان اور اُس کی شاعری و نثر نگاری کی تدریجی ترقی کے متعلق عام رائے قائم کرنے میں مدد نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب کے مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔

مُدّت سے تمنّا تھی کہ کوئی صاحب ایک مختصر لیکن با اصول، مکمل لیکن رطب و یابس سے پاک اور مذاقِ حال کے مطابق تاریخ زبان و ادب اُردو تالیف کر کے طلبہ کی سہولت اور دلچسپی کا سامان مُہیّا کریں۔ آخر سوچا کہ یہ کام خود میں ہی کیوں نہ کروں خیال آیا

اور خیال کے ساتھ ہی ہمت۔ شروع ہونے کی دیر تھی کہ چند ماہ کی کاوش سے جو ہو سکا ہدیہ ناظرین ہے ؎

شرم آید از بضاعت بے قیمتم ولیک　　　　در شہر آبگینہ فروش است جوہری

تنویر ادب کو ضرورتاً حصّۂ نظم و حصّۂ نثر میں تقسیم کیا ہے۔ اور دونوں حصّوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ دَور قائم کئے ہیں۔ اگرچہ ادوار کا خیال مستعار ہے لیکن تعیّنِ ادوار میں ایک حد تک جدّت کے ساتھ سہولت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اِس تعیّن میں زمان و مکاں سے زیادہ زبان کی نوعیت، طرزِ شاعری اور خیالات کے عام رُجحان کو مدِّنظر رکھا ہے اور حصّۂ نثر میں موضوع اور اسالیب بیان کو ہر دَور کے اختتام پر مجموعی نقد و تبصرہ درج کیا ہے تاکہ کتاب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ادبی ترقی کا خاکہ بھی ذہن نشین ہوتا جائے۔

ہر شاعر اور انشا پرداز پر انفرادی حیثیت سے بھی تنقید کی ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ مصنّفین کی خصوصیات کو اِس طرح نمایاں کیا جائے کہ اُن میں سے ہر ایک کے لئے بزمِ ادب میں الگ الگ نمایاں اور ممتاز جگہ معیّن ہو سکے۔

ادوار پر مجموعی اور شعراء پر انفرادی تنقید کی ذمّہ داری مجھ ناچیز ہی پر عائد ہوتی ہے۔ البتہ مصنّفین کے حالاتِ زندگی کے لئے اُردو فارسی تذکرے۔ ادبی تاریخیں اور ادبی مضامین پیشِ نظر رہے ہیں۔ اِن کتب کے مصنّفوں اور مؤلفوں میں بعض بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں۔ ناچیز اُن کے روبرو زانوئے تلمّذ تہ کرتا ہے۔ بعض اِس دُنیا میں نہیں چنانچہ اُن کے مزاروں پر تشکّر و امتنان کے پھول چڑھاتا ہے۔

خاکسار صغیر احمد جان

# فہرست مضامین

# باب اوّل

## اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقّی

**اُردو کے اجزائے ترکیبی** زبان اُردو کی کسی عبارت کو محض سرسری طور پر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں متعدد زبانوں کے الفاظ کی آمیزش ہے۔ اِس میں اسمار زیادہ تر فارسی۔ عربی یا سنسکرت کے ملیں گے۔ روابط زیادہ تر پراکرت کے اور افعال زیادہ تر ہندی اور کچھ فارسی یا فارسی اور ہندی سے مرکب۔ اِن زبانوں کے علاوہ ترکی۔ پرتگالی۔ انگریزی وغیرہ زبانوں کے الفاظ بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ اس آمیزش اور الفاظ کی رنگارنگی سے پتا چلتا ہے کہ زبان اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔

**مخلوط زبان کی پیدائش** ایسی مخلوط زبان کیونکر ظہور میں آتی ہے؟ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کے یہاں مہمان آتی ہے تو پہلی آؤ بھگت میں بڑا تکلّف ہوتا ہے۔ نہ میزبان مہمان کی زبان سمجھتا ہے نہ مہمان میزبان کی۔ صاحب سلامت تو خیر اشاروں اشاروں میں ادا ہو جاتی ہے لیکن ادھر اُدھر کی باتوں کے لئے یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مہمان میزبان کی زبان کے کچھ الفاظ مستعار لے کر اپنی زبان میں ملاتا ہے اور کچھ ہاتھوں کے اشاروں سے، کچھ آنکھوں کی حرکت سے

کچھ لہجہ کی لچک سے اپنا مطلب ظاہر کر دیتا ہے۔ اسی طرح میزبان بھی اپنی اور نو وارد کی زبان کو خلط ملط کر کے جواب دیتا ہے۔ یہ دقتیں کچھ مدت تک حائل رہتی ہیں مگر جلد ہی مہمان اور میزبان کو ایک دوسرے کی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے اور دونوں اپنے اپنے اظہار مطالب کے لئے ایک دوسرے کی زبانوں کو ملا جلا کر بہ آسانی بولنے لگتے ہیں۔

اب اگر یہ مہمان مہمان کی حد سے گذر کر میزبان کے پڑوس ہی میں سکونت اختیار کر لے تو اظہار مطالب کا یہ سلسلہ طول کھینچ لیتا ہے۔ مہمانی اور میزبانی کی میٹھی میٹھی باتوں اور مزے مزے کی حکایتوں سے گذر کر کاروباری باتیں۔ صنعتی باتیں۔ علمی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہی کم مایہ اور کم حیثیت مخلوط زبان ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے یا اگر اسی مخلوط زبان کی خوش قسمتی سے کہیں کسی خوش مذاق شاعر نے اشعار موزوں کر دیئے اور کسی نے نثر میں بھی کچھ تصنیف کر ڈالا تو لیجئے ایک زبان تیار ہو گئی۔ جو چاہئے نام رکھ لیجئے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے ایک مخلوط زبان عالم وجود میں آتی ہے، نشو ونما پاتی ہے اور جوان ہو کر پرانی اور بوڑھی زبانوں کو اپنی شوخی اور رعنائی سے انگلیوں پر نچاتی ہے۔

**زبان اُردو** زبان اُردو کو بھی موجودہ حالت تک پہنچنے میں بعینہ انھیں حالات و مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ قدیم اسلامی فتوحات کے زمانے میں فارسی اور ہندی زبانوں کے باہم تصادم اور میل جول سے ایک نئی زبان ظہور میں آئی جو رفتہ رفتہ ترقی کرتی رہی اور آج اُردو ہو گئی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اُردو کی ابتدا مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہم میل جول

اور کاروباری تعلق سے ہوئی لیکن قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں کب آئے اور کہاں کہاں اقامت گزیں ہوئے اور کس علاقے میں اُردو کی پیدایش ہوئی اور کس کس زبان کی گود میں پرورش پائی اور کس فضا میں عالم شباب کو پہنچی۔

ساتویں صدی عیسوی میں کچھ عرب تجارت کی غرض سے ساحل مالابار پر وارد ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام دکن میں پھیل گئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انھیں عرب تجّار اور دکھنیوں کے باہم اجتماع اور اختلاط سے ایک نئی زبان کی بنیاد پڑی جس نے ترقی کرتے کرتے موجودہ اُردو کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن یہ قیاس صحیح نہیں۔ کیونکہ اُردو کا تعلق دکھن کی ڈریوڈین زبانوں سے نہیں ہے اور نہ اُسے کچھ عربی ہی سے مناسبت ہے۔ بلکہ اس کے اجزائے ترکیبی خالص ایرین ہیں۔ یعنی سنسکرت اور فارسی۔

جنوبی ہند کے علاوہ عرب سندھ میں بھی وارد ہوئے۔ یہاں یہ لوگ محض تجارت کی غرض سے نہیں بلکہ فتوحات بڑھانے کی غرض سے آئے اور ۷۱۲ء میں سندھ پر مسلّط ہوگئے اور تقریباً چارسو برس تک اس علاقے پر قابض رہے۔

گمان ہوتا ہے کہ اس طویل مدّت میں عربوں اور سندھیوں کے باہم میل جول سے کسی زبان کی ابتدا ہوئی ہو جو دراصل زبان اُردو کی ابتدائی شکل ہو۔ لیکن یہ قیاس بھی مندرجہ بالا لسانی تحقیقات کی رو سے رد ہوجاتا ہے۔ عربوں اور سندھیوں کے میل جول سے ایک نئی زبان ظہور میں تو

آئی لیکن وہ اُردو نہیں تھی بلکہ موجودہ سندھی زبان کی ابتدائی شکل تھی۔

فتوحاتِ سندھ کے بعد دسویں صدی میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ اور گوالیار اور دریائے گنگ تک کے علاقے فتح کر ڈالے۔ لاہور کو دارالحکومت قرار دے کر وہاں ایک سپہ سالار مع افواج کے چھوڑا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کے جانشینوں نے پنجاب کی حکومت کو استحکام دیا اور ۱۱۹۳ء تک پنجاب میں خودمختار اسلامی سلطنت قائم رہی اور لاہور اس کا دارالخلافہ رہا۔ یہاں تک کہ ۱۱۹۳ء میں محمد غوری نے ہندوستان فتح کر کے دہلی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور پنجاب کو بھی دہلی ہی کی حکومت میں شامل کر لیا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اُردو کی ابتدا ۱۱۹۳ء سے ہوئی لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ محمد غوری سے قبل مدت سے پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس طویل مدت میں فارسی اور مقامی زبان کے باہم ارتباط و اختلاط سے کسی دوسری زبان کی ابتدا نہ ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ زبان اُردو کی داغ بیل فتح دہلی سے بہت قبل پڑ چکی تھی۔ مگر زبان کی حیثیت البتہ فتح دہلی کے بعد ہی اختیار کی۔

۱۰۰۰ء کے لگ بھگ موجودہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور الہ آباد کے درمیانی علاقوں میں جو پراکرت بولی جاتی تھی اُسے سوراسینی پراکرت کہتے تھے اور یہی پراکرت زبان اُردو کی ماں ہے۔

**اُردو۔ پنجابی اور برج بھاشا ماں جائی بہنیں ہیں** | اُردو نہ پنجابی سے

نکلی ہے نہ کھڑی بولی یا برج بھاشا سے بلکہ اُس زبان سے نکلی ہے جو ان دونوں زبانوں کی ماں ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ اردو پنجابی سے بھی ملتی جُلتی ہے اور کھڑی بولی سے بھی ۔

**اُردو دکن پہنچتی ہے**

زبان اُردو نے شمالی ہند میں جنم لے کر تقریباً تین سو برس تک ترقی کے منازل طے کئے اور آخر اس قابل ہوگئی کہ کاروباری معاملات میں عام طور پر استعمال ہونے لگی ۔ عوام اس مخلوط زبان کو پراکرت اور فارسی پر ترجیح دینے لگے اور روزانہ زندگی میں اسی کو اختیار کیا ۔

۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے احکام جاری کئے کہ دہلی اور گرد و نواح کے باشندے فوراً نقل سکونت کرکے دولت آباد (دکن) کو آباد کریں ۔ چنانچہ ان احکام پر مستعدی کے ساتھ عمل کیا گیا اور تمام باشندے مرد ۔ عورتیں ۔ بچے ۔ جوان ۔ بوڑھے سب اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دولت آباد چلے گئے چند سال بعد بادشاہ نے پھر حکم جاری کیا کہ جو لوگ واپس دہلی جانا چاہیں وہ جا سکتے ہیں ۔ اس حکم کے بعد چند صاحبِ استطاعت لوگ تو دہلی چلے آئے لیکن بڑی تعداد دولت آباد ہی میں مقیم رہی ۔ اس طرح ان کی زبان اُردو نے بھی دکن میں جڑ پکڑ لی ۔

**اُردو ترقی کی منزلیں کیونکر طے کرتی ہے**

جب شمالی ہند کی مقامی زبان فارسی سے ملی تو اُس نے ارادۃً یا بلا ارادہ فارسی الفاظ قبول کرنے شروع کر دئے ۔ ہندی شعراء مثلاً سور داس ۔ کبیر وغیرہ کے کلام میں اس اختلاط کی مثالیں ملتی ہیں ۔ اسے زبان اُردو کی ترقی کی پہلی منزل سمجھئے ۔

مسلمان بہت سی روزانہ استعمال کی چیزیں اپنے ہمراہ لائے۔ اِن کے نام یا تو فارسی تھے یا عربی۔ چنانچہ وہ نام بجنسہ یا کسی قدر ردّ و بدل کے ساتھ ہندی میں داخل ہوگئے۔

مسلمان صرف عربی یا فارسی رسم الخط سے واقف تھے چنانچہ اُنھوں نے خط و کتابت وغیرہ مقاصد کے لئے اس رسم الخط کو دیوناگری رسم الخط پر ترجیح دی۔ یہ ترقی زبان کی دوسری اہم منزل تھی۔ فارسی رسم الخط نے زبان اُردو کو رائج الوقت زبان سے قطعی ممیز کر دیا۔

صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام کے لئے زبان اُردو ہی کو اختیار کیا کیونکہ یہی عوام کی زبان تھی اور اِسی زبان میں نظم و نثر کی کتابیں تصنیف کیں جن کا شمار اُردو کی قدیم ترین تصانیف میں ہوتا ہے۔ اِسے ترقی کی تیسری منزل کہیے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا زبان اُردو میں گوناگوں خصوصیات ترقی کرتی گئیں۔ شعر و شاعری کی عمارت فارسی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ جملہ اصناف سخن۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی وغیرہ حتیٰ کہ اسلوب بیان فارسی سے لیا گیا۔ صرف و نحو بھی فارسی صرف و نحو کے نمونوں پر مرتّب کی گئی اور رفتہ رفتہ اُردو اِس منزل پر پہنچی جس پر اب موجود ہے۔

**ابتدائی اُردو کے نمونے** | مولوی عبدالحق صاحب نے ایک کتاب مرتّب کی ہے جس کا نام ہے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" اِس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صوفیہ کبھی کبھی اُردو میں بھی اظہار خیال

کیا کرتے تھے اور اپنے ملفوظات میں ایک آدھ جملے کی شکل میں اُسے جگہ دیدیا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلا جملہ جو ہماری نظر سے گزرتا ہے وہ خواجہ فرید شکر گنج ؒ کا ہے۔ آپ ۵۸۴ھ (۱۱۸۸ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۷۰ھ (۱۲۷۱ء) میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کا جملہ یہ ہے:-

"پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

اِس قسم کے بہت سے جملے ملفوظات میں ملتے ہیں لیکن اس زمانے میں حضرت امیر خسرو (متوفی ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) نے فارسی اور ہندی کی لطیف آمیزش سے جو اشعار وغیرہ لکھے ہیں وہ اُردو شاعری کے قدیم ترین نمونے سمجھے جا سکتے ہیں مثلاً

رفتم بہ تماشا بہ کنارِ جوئے    دیدم بہ لبِ آب زنِ ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مویت    فریاد بر آورد کہ دُر دُر موئے

زرگر پسرے چوں ماہ پارا    کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست    پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

انہیں کے ساتھ ساتھ پہیلیاں۔ مکرنیاں۔ دوسخنے۔ انمل اور طرح طرح کے گیت لکھے۔ "خالق باری" جو ایک منظوم لغت ہے امیر خسرو ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ سے غزلیں بھی منسوب ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو:-

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روزے وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

یہ تھا پہلا قدم جو اُردو ادب نے عالم وجود میں رکھا۔ امیر خسرو نے جو کچھ بھی لکھا وہ محض ایک خوش طبعی تھی اور زورِ طبع کی ایجاد۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہی رنگ کسی قدر ترمیم کے بعد آگے چل کر ایک مستقل ادب کی حیثیت اختیار کرے گا۔ اس تفریحی منزل میں چند باتیں ایسی ملتی ہیں جو آگے چل کر ہمارے ادب کی خصوصیات قرار پائیں۔ ا۔ مضامین میں عاشقانہ یعنی غزل کی بنیاد پڑ گئی۔ ب۔ فارسی عروض اختیار کیا گیا۔ ج۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی کی گئی۔

زبان اُردو اُس زمانے میں محض ضرورتاً بولی جاتی تھی۔ خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی یا مقامی ہندی زبان میں۔ اور اگر کاروباری چٹھیاں اس زبان میں لکھی بھی جاتی ہوں گی تو انھیں جمع کون کرتا ہوگا کہ ہم تک بطور نمونہ پہنچتیں۔

شمالی ہند میں امیر خسرو کے انتقال کے بعد سناٹا ہو گیا۔ تقریباً چار سو برس تک کسی نے اِس مخلوط زبان کی طرف توجہ نہیں کی اور اگر کسی نے

کچھ لکھا پڑھا بھی ہوگا تو وہ دستبرد زمانہ کے ہاتھوں فنا ہوگیا ہوگا۔ یہاں عہد جہانگیری میں ایک بزرگ تھے غوّاصی نامی۔ انھوں نے طوطی نامہ نخشبی کا ترجمہ نظم میں اس التزام کے ساتھ کیا تھا کہ ہر شعر میں ایک مصرعہ فارسی کا ہے اور دوسرا اُردو کا۔ دکن میں البتہ اُردو نے بڑی ترقی کی۔

**زبان اُردو کا نام** | قبل اس کے کہ باب اوّل کو ختم کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زبان اُردو کے نام کے متعلق بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ واضح ہو کہ فارسی اور ہندی کے اختلاط اور ارتباط سے جو زبان عالم وجود میں آئی اور جو آئندہ چل کر اُردو کہلائی اپنے ابتدائی عہد میں "ہندی" ہی کہلاتی تھی۔ بعض قدیم شعرا نے اس زبان کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ جہاں تک کتابوں سے پتا چلتا ہے شاہجہاں کے عہد تک یہ زبان ہندی ہی کے نام سے موسوم رہی۔

شاہجہاں نے دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، اور شہر پناہ وغیرہ عمارتیں تعمیر کرائیں اور دہلی کا نام شاہجہاں آباد رکھا۔ اور وہاں کے بازار کو اُردوے معلّی کا خطاب دیا۔ اُردو کے لغوی معنی ہیں امرا و سلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ۔ چونکہ وہ مخلوط زبان جو ہندی کہلاتی تھی عوام کی زبان تھی، بازاروں میں لین دین کے کام آتی تھی اور شاہی کیمپ میں بولی جاتی تھی، اس مناسبت سے یہ زبان بھی اُردو کہلانے لگی۔ اور اسی نام سے اب تک مشہور چلی آتی ہے۔

**ریختہ** | لفظ ریختن فارسی زبان میں متعدد معنوں میں آتا ہے اور معنوں سے قطع نظر (۱) بنانے، ایجاد کرنے۔ (۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی چیز بنانے اور (۳) موزوں کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے[۱]۔ چنانچہ لفظ "ریختہ"

---

[۱] پنجاب میں اُردو صد ۱۲

کے معنی ہوئے۔ ایجاد کیا ہوا۔ موزوں کیا ہوا۔ وغیرہ۔ حضرت امیر خسرو نے لفظ ریختہ کو اصطلاحاً استعمال کیا تھا اور اس سے وہ کلام موزوں مراد لیا تھا جس میں فارسی اور ہندی زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں۔ رفتہ رفتہ اس کا اطلاق اُس تمام کلام موزوں پر ہونے لگا جس میں فارسی اور ہندی الفاظ ملے جُلے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لفظ زبان اُردو کے لئے عام ہوگیا۔ کہیں اس سے مراد اُردو کا کلام موزوں ہوتا تھا اور کہیں زبان اُردو خود۔ یہ لفظ غالب کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

لیکن غالب کے بعد اس لفظ کا پتا نہیں چلتا اور اب اس کا استعمال زبان اُردو یا اُس کے کلام موزوں کے معنی میں متروک ہوچکا ہے۔

# باب ۲

## ابتدائی دور۔ دکن میں

**تمہید** | گزشتہ باب میں بیان ہوچکا ہے کہ زبان اُردو اپنی نہایت ابتدائی شکل میں محمد تغلق کی افواج اور دہلی اور گرد و نواح کے باشندوں کے ہمراہ دکن پہنچی اور وہاں رائج ہوگئی۔

محمد تغلق کے بعد ۷۴۸ھ میں حسن گنگو نے دکن میں بہمنی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ یہ خاندان تقریباً دو سو سال تک دکن میں حکومت کرتا رہا اور ۱۵۲۶ء میں

ختم ہوا۔ بہمنی خاندان کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔ (۱) عماد شاہی (۲) نظام شاہی (۳) برید شاہی (۴) عادل شاہی (۵) قطب شاہی۔ آخری دو سلطنتیں یعنی عادل شاہی اور قطب شاہی اُردو کی ترقی میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

اگرچہ عادل شاہوں سے قبل بھی زبان اُردو اشاعت اسلام میں دین اور روزمرّہ گفتگو میں استعمال ہوتی تھی لیکن عادل شاہوں نے اس زبان کو بہت ترقی دی۔ ابراہیم عادل شاہ متوفی ۱۵۵۷ء کے زمانہ میں اُردو نے شاہی دفاتر پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر ہے کہ جو زبان حکومت کی ہو اُس کی قدر رعایا کے دل میں کس قدر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسی عہد سے اس زبان میں باقاعدہ تصنیف و تالیف شروع ہو گئی۔

**اُردو کا اوّلین شاعر** مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اُردو" میں فرماتے ہیں کہ وجیہ الدین وجدی اُردو کے پہلے شاعر ہیں۔ وجدی قلی قطب شاہ کے عہد میں گزرے ہیں۔ سنہ ۵۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱۱ء میں انتقال کیا۔ لیکن مزید تحقیقات جستجو کرتی ہوئی اس سے بھی قدیم زمانہ میں پہنچتی ہے۔ اور یوسف عادل شاہ کے عہدِ حکومت میں (۱۴۹۰ء سے ۱۵۱۰ء) شاہ میرانجی کو قدیم ترین شاعر پاتی ہے۔

## ۱۔ شاہ میرانجی شمس العشاق

آپ یوسف عادل شاہ کے عہد میں گزرے ہیں۔ بیجاپور کے رہنے والے

اور بڑے صوفی اور اہل حال وقال بزرگ تھے۔ آپ نے مقامی علماء سے علوم متداولہ حاصل کیے اور فارغ التحصیل ہو کر حج کعبۃ اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ مدینہ منورہ میں بارہ سال مقیم رہے اور ہر سال فریضۂ حج بجا لائے۔ حجاز سے واپس آکر آپ نے بیجاپور کے قلعہ کے باہر قیام کیا۔

شاہ میرانجی چشتیہ خاندان میں خواجہ کمال الدین بیابانی سے بیعت تھے آپ نے ۲۵ شوال ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں اس جہان فانی سے کوچ فرمایا اور بیرون قلعہ بیجاپور بمقام شاہ پور مدفون ہوئے جہاں ہر سال ۲۵ شوال کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

شاہ میرانجی نے نظم ونثر کی پانچ تصانیف یادگار چھوڑیں :—

(۱) شرح مرغوب القلوب۔ (۲) سب رس۔ یہ دونوں کتابیں نثر میں ہیں۔

(۳) خوش نامہ۔ یہ ایک سو ستر اشعار کی مختصر مثنوی ہے جس میں ایک دوشیزہ کا قصہ بیان ہوا ہے جسے اپنے مرشد سے کمال عقیدت تھی اور جو ستر سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئی۔

(۴) شہادت الحقیقت۔ اس نظم میں ۵۶۳ بند ہیں۔ ہندی بحر میں لکھی گئی ہے اور تصوف کے متعلق ہے۔ اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے۔

(۵) خوش نغز۔ یہ بھی ایک مختصر سی مثنوی ہے۔ ایک لڑکی میرانجی سے تصوف کے متعلق چند سوال کرتی ہے۔ آپ ان کا جواب دیتے ہیں۔ اس مکالمے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

## ۲۔ شاہ برہان الدین جانمؒ

آپ شاہ میرانجی شمس العشاق کے بیٹے اور خلیفہ تھے اور اپنے وقت کے باکمال بزرگ اور شاعر۔ لوگوں کو آپ کے ارشادات سے بے انتہا فیض پہنچا۔ آپ کی آخری تصنیف ارشاد نامہ ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ گویا آپ سنہ ۹۹۰ھ تک حیات تھے۔

مولانا عبدالحق اور ڈاکٹر محمد حفیظ سیّد (الہ آباد یونیورسٹی) کے پاس شاہ بُرہان الدین جانمؒ کی تصانیف کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں :۔

(۱) **وصیت الہادی**۔ یہ رسالہ ذکر کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ روح پر ایک مختصر سی بحث بھی اس میں شامل ہے۔

(۲) **نکتۂ واحد**۔ ۱۲ اشعار کی مختصر نظم ہے جس میں مسئلہ توحید کی بحث ہے۔

(۳) **نسیم الکلام**۔ ۲۵ اشعار کی نظم ہے۔ اس میں قرآن شریف کی متعدد آیتوں کے ترجمے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

(۴) **رموز الواصلین**۔ یہ مثنوی بھی صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہے۔

(۵) **بشارت الذکر**۔ مختصر نظم ہے جس میں ذکر بالجنان اور ذکر باللسان کے طریقے بیان ہوئے ہیں۔

(۶) **حجت البقا**۔ اس میں توحید اور صفات باری تعالیٰ کی بحث ہے۔

(۷) ارشاد نامہ۔ یہ شاہ صاحب کی طویل ترین مثنوی ہے۔ اس میں کل ۲۵۰۰ اشعار ہیں۔ اس کا موضوع بھی تصوّف ہی ہے۔

(۸) منفعت الایمان۔ اس میں ملاحدہ اور کفّار کے اعتقادات سے بحث ہے اور آخر میں توحید کا بیان ہے۔

(۹) سکھ سہیلا۔ یہ بھی صوفیانہ نظم ہے۔ اس میں ہندو فقراء، سادھوؤں اور یوگیوں کے طریقۂ نفس کشی پر تنقید کی ہے اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیئے بغیر اس کے روحانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اِن تصانیف کے علاوہ جانمؔ نے متفرق دوہرے اور خیال بھی تصنیف کئے ہیں۔ آپ کی تصانیف مقامی اور مذہبی تعصبات سے مبرّا ہیں۔ زبان اور طرزِ بیان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ ہندی الفاظ اور ہندی طرزِ ادا زبان پر مسلّط ہیں۔ بحریں بھی زیادہ تر ہندی ہی ہیں۔ عربی اور فارسی الفاظ کو اس طرح نظم کیا ہے جس طرح وہ عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ مثلاً فہم کو فہام، علیحدہ کو الادی، سر کو سیر وغیرہ۔

## ۳۔ وجیہ الدین وجدی

مشہور بزرگ تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "تحفۂ عاشقاں" ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں تصنیف کی جو حضرت شیخ فرید الدین عطار کے خسرو نامہ کا ترجمہ ہے۔ ایک اور مثنوی پنچھی نامہ جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے وجدی ہی کے نام سے منسوب ہے۔ تحفۂ عاشقاں ایک ضخیم مثنوی ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:—

کروں پاک دل ہور زباں پاک سوں ❊ ثنا پاک اس عاشقِ پاک کوں
کہ جس سے ہوا ہے وہ گم عشق کا ❊ اجوں لک اُبلتا ہے خم عشق کا
پڑیا عکس اس نور کا جس رخن ❊ جھلکنے لگا آرسی کے ثمن
سو اس آرسی میں کیا جیوں نظر ❊ ہوا عاشق اپنا اپس دیکھ کر
اپس کچھ پرتو کوں معشوق جان ❊ لیا مبتلا ہوکے عاشق کی شان
نکل کنج مخفی سے خلوت کے بھار ❊ کیا جلوہ کر کثرتِ بے شمار

### سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء - ۱۶۱۱ء)

سلطان محمد قلی قطب شاہ علم و فن کا قدر دان اور صاحبِ علم و فضل بادشاہ ہی نہیں تھا بلکہ ملک سخن کی عنانِ حکومت بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔

ایک ضخیم کلیات یادگار ہے جس میں مثنویاں۔ قصیدے۔ ترجیع بند۔ مراثی اور رباعیات شامل ہیں۔ قطب شاہ پہلے شاعر ہیں جن کا کلام بہ ترتیب حروف تہجی جمع ہوا ہے۔ یہ کلیات ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ نے مرتب کیا تھا۔

اُن کے کلام میں سادگی، اصلیت اور جدت پائی جاتی ہے۔ مقامی دلچسپیوں اور دیسی روایتوں کو نہایت لطف سے نظم کیا ہے۔ اگرچہ استعارات اور تشبیہات کی نُدرت اور تخیل کی بلند پروازی ان کے کلام میں نہیں۔ تاہم فطری خیالات کی سادگی وہ مزا دیتی ہے کہ ہزار تکلفات نثار۔ ہندی الفاظ کو نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے۔ تمام کلام ہندی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہی ہندی ترکیبیں۔ وہی ہندی استعارے اور تشبیہیں جھنڈ فارسی

الفاظ ہندو سورماؤں اور جانبازوں کی روایات کے حوالے۔ یہاں تک کہ اظہار عشق بھی جنس لطیف ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور یہ خاص ہندی شاعری کا رنگ ہے اور عجب مزا دیتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :-

رکھ ایک ہے ہر ٹھار کی دھن لاکھ چمن ہے　　لکھ جوت ہے ہر ٹھار دلے ٹیک رتن ہے
کس ٹھار میں دستا نہیں سب ٹھار ہے بھرپور　　دیکھن کو سکت کاں اُسے ہر ٹیک نین ہے
سمندر ہے ایک ہور ندیاں ہیں سو ہزاراں　　باتاں سو کروڑاں ہیں ولے ٹیک رسن ہے
منج عشق کی اگ کا ایک چنگی ہے سورج　　اس اگ کے شعلے کا دھواں سات گگن ہے

پیا باج پیالہ پیا جائے نا　　پیا باج یکتل جیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے　　کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا

قطب شہ نہ دے منج دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

**سلطان محمد قطب شاہ** (۱۶۱۱ء - ۱۶۲۵ء) فارسی اور اُردو میں آپ کے دو دیوان موجود ہیں۔ فارسی میں ظل اللہ اور اُردو میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے۔ کلام میں شیرینی۔ صفائی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

رہن باسکی من پیا باج دیکھی　　ہوئے تن کوں سکھ جب ملے پیو بالا
مرا دل ہے زر الفت کا کارخانہ　　نہیں منگلوں بازار والا کا حاجت
سُنو لوگ میری پیرم کی کہانی　　کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

**سلطان عبداللہ قطب شاہ** (۱۶۲۵ء - ۱۶۷۲ء) آپ کا تخلص عبداللہ تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

دلا حق کی طرف ہو کہ حق آرام دو یگا — سعادت کی تری بات سرانجام دو یگا
روپ مبرے لال کا آئے نہ تحریر میں — چاند عطارد اگر ہو ویں قلم ہور دوات

# قطب شاہی عہد کے دیگر شعراء

دربار گولکنڈہ و بیجاپور اس عہد میں شعراء کا ملجا و ماوا تھا۔ ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا اور ہر سر میں ذوق نغمہ سرائی کا سودا تذکروں سے متعدد شعراء کے ناموں کا تو علم ہوتا ہے لیکن افسوس کہ اُن کی زندگی کے حالات دستیاب نہیں ہوتے۔

**ابن نشاطی** سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے نامور شاعر ہیں۔ انھوں نے ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں مثنوی پھول بن تصنیف کی۔ یہ مثنوی کئی لحاظ سے قابل قدر ادبی کوشش ہے۔ سلاست اور روانی اس کی خصوصیات ہیں۔ صنائع لفظی و بدائع معنوی کا استعمال نہایت سلیقہ سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرتی، اخلاقی اور تاریخی حیثیت سے بھی یہ مثنوی بہت اہم ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانے کے رسم و رواج کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

اوّل میں حمد رب العالمیں کا — دل و جاں سوں کہوں جاں آفریں کا
خداوندا تجے سنہے جم خدائی — ہمیشہ تجکوں ساجی کبریائی

ازل سوں نیں سمج تیرا بدایت　　ابد کوں فہم نیں تیرا نہایت

**غواصی** | قطب شاہی عہد کے نامور شاعر ہیں۔ دو مثنویاں اُن کی یادگار ہیں
(۱) فسانہ سیف الملوک و بدیع الجمال۔ تاریخ تصنیف ۱۰۲۷ھ
(۱۶۱۷ء)۔

برس ایک ہزار ہور ستاویس میں　　کیا ختم یہ نظم دن تیس میں

(۲) طوطی نامہ۔ یہ مثنوی ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں تصنیف ہوئی۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

الٰہی جگت کا الٰہی سو توں　　کرنہار جم بادشاہی سو توں

ترے حکم تل تو کر آسماں کے　　رعیت ملک تیرے فرمان کے

پھریا تس گھراں بیچ تارے حشم　　کریں نوبتیاں سوں الناک دمبدم

**ملا قطبی** | آپ نے ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے اُردو میں کیا۔ ملاحظہ ہو:۔

بولوں صفت میں بے گننت　　اُس خالق جن و بشر

نردھار کر آسماں رکھیا　　سورج ستارے ہور چندر

جوں بزرگی دی عرش کوں　　پنکھے اڑے یک پائیسنی

جوں بیچ برساں چارسو　　انپڑے بزاں پائے دگر

**مرزا** | آپ ابوالقاسم تاناشاہ کے مصاحب تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

عارض نہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا　　سمجھی ہمن خلقت کو نہ تجھ نقال سوں اچھا

مرزا وہ نونہال کدھر مٹ گئے چمن　　لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

**بحری** قاضی محمود بحری صاحب حال و قال صوفی اور مشہور شاعر تھے۔ آپ کے والد کا نام بحر الدین تھا۔ اسی رعایت سے آپ نے بحری تخلص اختیار کیا۔ آپ اپنی زندگی میں بہ حیثیت شاعر زیادہ مشہور نہیں تھے۔ آپ زیادہ تر مذہبی اور صوفیانہ مضامین نظم کیا کرتے تھے۔ اور اس قسم کے مضامین عام پسند نہیں ہوتے۔ تاہم سلسلہ تصنیف برابر جاری رہا۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے دوران میں آپ حیدرآباد پہنچے۔ راستہ میں قزاقوں نے آپ کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اور ساتھ ہی آپ کا سرمایہ سخن بھی لٹ گیا۔

آپ کی مثنوی "من لگن" کے مطالعہ سے آپ کی زندگی کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں تکمیل کو پہنچی۔ لکھا ہے کہ میں نے کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ نہیں کیا۔ نہ کسی شاعر کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔

بحری نے تین تصنیفیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

(۱) مثنوی من لگن۔ یہ مثنوی بہت ضخیم ہے۔ تعداد اشعار ۳۷۹۰ سے اوپر ہے۔ تصوّف اس مثنوی کا موضوع کلام ہے۔

(۲) دیوان۔ اس میں کل ایک سو گیارہ غزلیات بہ ترتیب حروف تہجّی درج ہیں۔

(۳) مثنوی بنگاب نامہ۔ اس مثنوی میں بارہ "جام" یعنی بند ہیں اور ہر بند میں متعدد اشعار۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

اسے روپ ترا رتی رتی ہے | پربت پربت ارتی رتی ہے
اوٹ اسے قلم اس گھڑی نہ گھر جائیں | ٹک نعت نگر کی سیر کر آئیں
ہے ناؤں احد نشانِ احمد | سرخی سو احد ہے پان احمد
مولا کے محب بنی کے نائب | مانس نہیں مظہر العجائب
ساگر ہیں سپور معرفت کے | بل عین ہیں نور معرفت کے

عالمگیر اورنگ زیب کی تعریف میں کہا ہے :—

دیندار، دلیر، ہور دانا | یک علم نہ سب منے سیانا

## شیخ شجاع الدین نوری

شمالی ہند میں بابر کے عہد حکومت میں مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا لیکن دکن میں ان کا رواج ہو چکا تھا۔ سلاطین عادل شاہی نے مجالس عزا کی ابتدا کی۔ لیکن ابتدا اگر فارسی مرثیہ گو شعرا خصوصاً محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے۔ اردو میں کوئی مرثیہ گو موجود نہیں تھا لیکن جب مجالس عزا کا خوب چرچا ہوا اور اردو زبان میں بھی کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی تو دکن میں ایک گروہ مرثیہ گو شعرا کا پیدا ہوا۔ اور شیخ شجاع الدین نوری مرثیہ گوئی کا باوا آدم قرار پائے۔

نوری بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ صاحب علم و فن اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ اکبر کے عہد حکومت میں آگرہ کا سفر کیا اور ایک مدت تک ابوالفضل اور فیضی کی صحبت میں رہے۔

نوری اپنی مرثیہ گوئی کی ابتدا کے متعلق فرماتے ہیں :—

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا — ولے سب تعصب دیا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجھکا ذرا — وہم مرثیہ کا بہل کر دیا
میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا — عجب حال آشورخانہ میں تھا
جن وانس سب کرتے تھے واہ وا — کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا — کبھی اس سے پہلے سنا نا پڑھا
اماماں سے اس کا ملے گا صلہ — کہ ہے نوری ہی موجد اس طرز کا

## ہاشم علی برہان پوری

یہ صنعت مرثیہ نگاری نوری کے بعد ہاشم علی برہان پوری کے حصے میں آئی۔ نمونۂ کلام یہ ہے:—

ختم ہے یو امتحان و یو بلا — ختم ہے جو حق سیں پیغام کا
تھا بر اولاد شفیع المذنبیں — ظلم بے حد در جہاں اقسام کا
زخم لاگا مرتضیٰ کے سر اوپر — گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا
زہر دے مارے حسن کو مکر سیں — سبز تھا وہ چہرۂ گلفام کا
کربلا میں تھا حسینؑ ابن علیؑ — آج غم ہیگا انھیں ایام کا

## ولی اورنگ آبادی

مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ اردو زبان و ادب کے دور اوّل کے خاتم الشعراء تھے اور دور دوم کے مقدم الشعراء۔

آپ کے نام کے متعلق اختلافات ہیں۔ کسی نے آپ کا نام شمس الدین بتایا ہے اور کسی نے شمس الحق۔ کوئی ولی الدین نام لکھتا ہے اور کوئی

حاجی ولی۔ لیکن تخلّص کے بارے میں سب متفق الرائے ہیں اور سب کے نزدیک آپ کا تخلّص ولی ہے۔

ولی ۱۶۶۸ء میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے اور بیس سال کی عمر تک وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اور اس کے بعد احمد آباد کا سفر کیا۔ وہاں آپ شاہ نورالدین گجراتی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

آپ کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے دو مرتبہ دہلی کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء یعنی اورنگ زیب کے عہد میں۔ دوسری مرتبہ ۱۷۲۲ء یعنی محمد شاہ کے زمانے میں۔ پہلی مرتبہ آپ کا قیام دہلی مختصر تھا۔ اس قیام کے حالات میں قابل ذکر صرف یہ امر ہے کہ آپ نے دہلی کے مشہور بزرگ اور فارسی شاعر شاہ سعد اللہ گلشن سے فیض صحبت حاصل کیا۔ دوسری مرتبہ آپ کا دیوان غزلیات بھی آپ کا رفیق سفر تھا جس نے دہلی میں خواص و عوام سے خراج تحسین وصول کیا۔ غزلیات کا اس قدر چرچا ہوا کہ گلی گلی کوچے کوچے میں جس کی زبان سے سنو ولی کی غزل کانوں میں پڑتی تھی۔ قوّال اور ارباب نشاط ولی کی غزلیات سے محفلوں کو گرماتے تھے۔ دہلی کے فارسی گو شعراء نے بھی محسوس کیا کہ زبان اردو میں بھی شعر و شاعری کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھی کبھی کبھی اس زبان میں سخن سنجی کی۔

کئی سال قیام کرکے ولی نے دہلی کو خیرباد کہا اور احمد آباد ہوتے ہوئے اورنگ آباد پہنچے۔ وہاں آپ نے ۱۷۳۲ء میں دہ مجلس منظوم تصنیف کی۔ ولی کا انتقال ۱۷۴۴ء میں بمقام احمد آباد ہوا۔

ولی کے کلیات میں غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ قطعہ۔ ترجیع بند۔ مثنوی۔ مستزاد وغیرہ اصناف سخن آپ کی قادر الکلامی اور مشق سخن سنجی کو مسلّم کرتی ہیں۔ اگرچہ باتیں سیدھی سادی ہیں تکلّف اور آورد کی گردِ اُن کے آئینہ سخن پر نہیں۔ تاہم آپ کے عاشقانہ اشعار میں تاثیر کے نشتر بھرے ہیں اور اخلاقی مضامین میں گہرائی پائی جاتی ہے۔ کلام سے تصوّف کی چاشنی ٹپکتی ہے اور کیوں نہ ٹپکے کہ خود زبردست صوفی اور بزرگوں کے عقیدت مند تھے۔ رموز حقائق کو تغزّل کے رنگ میں اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ تاثیر کے نشتر دل میں کھٹکتے ہیں۔

آپ نے قصیدے بھی خوب کہے ہیں۔ زبان اگرچہ ابتدائی منازل طے کر رہی تھی تاہم آپ کے قصیدوں میں زور کلام۔ شوکت الفاظ اور روانی کی کیفیت نظر آتی ہے۔

ولی کی زبان وہی ہے جو دیگر دکنی شعراء کی ہے لیکن منجھتے منجھتے اس قابل ضرور ہو گئی ہے کہ چند مخصوص دکنی الفاظ کو چھوڑ کر میر و سودا کی زبان سے زیادہ قدیم معلوم نہیں ہوتی۔ بعض بعض اشعار تو ایسے بھی ملتے ہیں کہ اگر آج بھی کوئی شاعر طبع آزمائی کرے تو اس سے بہتر زبان لکھنے پر قادر نہ ہو سکے۔ ولی کی زبان کا اصلی جوہر ہمواری اور سلاست ہے جو ہر رنگ میں جلوہ گر ہے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا     جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہوں گا

بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہرگاہ     جلدی سے ترے درد کے درماں سے کہوں گا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار — مدعا ہے چشم گوہر بار کا
بیوفائی نہ کر خدا سوں ڈر — جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور — خود نمائی نہ کر خدا سوں ڈر
اے ولی غیر آستانۂ یار — جبہہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر
جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا

تا حشر رہے بوئے گلاب اس کے عرق سے
جس بر میں یکبار وہ گل پیرہن آوے
کھینچیں اپس انکھیاں میں جوں کحل جواہر
عشاق کے گر ہاتھ وہ خاک چرن آوے

## تبصرہ

**زبان** اس دور کے شعراء کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ولی تک پہنچتے پہنچتے زبان میں کافی صفائی اور سلاست آگئی ہے۔ تاہم ولی کے کلام میں کافی تعداد ایسے الفاظ اور روابط کی موجود ہے جو دکنی اردو کے لئے مخصوص ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک مختصر سی فہرست ان الفاظ کی درج کردی جائے۔

سوں ۔ سین ۔ سیتی (بجائے سے)، کوں (کو)، ہمن کو (ہم کو)

نمن (طرح)۔ موہن، سریجن، پی، پئیتم (معشوق)۔ جگ منے۔ (دنیا میں)۔ بر منے (بر میں یعنی گود میں)۔ مجھ دل (میرا دل)، تجھ لبا (تیرا لب)۔ بچن (کلام)۔ نت (ہمیشہ)۔ مکھ (منھ)۔ بھیتر (اندر)۔ بھواں (بھویں)۔ پلکاں (پلکیں)۔ یو (یہ)۔ بگانہ۔ دوانہ (بیگانہ۔ دیوانہ)۔ تسبی (تسبیح)۔ سہی (صحیح)۔ میں کہا (میں نے کہا)۔ نئیں (نہیں)۔

اِن قدیم الفاظ کے باوجود گذشتہ دیگر شعراء کے کلام میں عموماً اور وؔلی کے کلام میں خصوصاً ایسے اشعار پائے جاتے ہیں کہ اگر ایک آدھ لفظ کو اُن میں سے بدل دیا جائے تو موجودہ زمانے کی زبان سے اُن کی زبان کچھ زیادہ قدیم نہ معلوم ہو۔ بلکہ بعض اشعار تو ایسے صاف ہیں کہ آجکل کی زبان بھی ان سے زیادہ صاف شعر نہیں لکھ سکتی۔ مثلاً

غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا  بیاباں اس کو گلزار ارم تھا
وہاں کی باد تھی شوریدہ صرصر  وہاں کی کنکری تھی مثل اخگر

مثنوی لعل و گوہر (عاجز)

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں  تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی  دیکھ رُتبہ دیدۂ بیدار کا
اے وؔلی ہونا سریجن پر نثار  مدّعا ہے چشمِ گوہر بار کا
دلِ عشّاق کیوں نہ ہو روشن  جب خیالِ صنم چراغ ہوا
اے وؔلی گلبدن کو باغ میں دیکھ  دلِ صد برگ باغ باغ ہوا

**اصناف سخن** اس دور کے شعراء نے جملہ اصناف سخن غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ اس دور میں مرثیہ بھی ایجاد ہوا۔ اور نوحہ بھی لکھا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ریختی جس کو رنگین کی طبع رنگین کی ایجاد سمجھا جاتا ہے درا صل اسی عہد میں پیدا ہوئی۔ مگر یوں کہیے کہ لکھنؤ کا سا زمانہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے فروغ نہیں پایا۔

**غزل** سلطان محمد قلی قطب شاہ نے غزل کی ابتدا کی۔ اور ولی نے اسے معراج کمال پر پہنچایا۔ غزلوں میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی خصوصیات ہیں۔ صفائی اور سادگی شاعر جو کچھ دیکھتا یا محسوس کرتا ہے۔ اسے اسی طرح لفظوں کا جامہ پہناتا ہے۔ گزرگاہ خیال میں جو مضمون ملتا ہے اسے اسی طرح زبان سے ادا کر دیتا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نون مرچ نہیں لگاتا۔ یعنی دور دور کی تشبیہوں اور نازک استعاروں سے تکلف اور تصنع پیدا نہیں کرتا۔ البتہ کہیں کہیں فارسی سے تشبیہیں اور استعارات و تلمیحات مستعار لیتا ہے اور انھیں تکلف سے نہیں بلکہ سلیقے سے سجاتا ہے۔

**قصیدہ** قصیدے کی جو جو خوبیاں ہیں یعنی زور کلام، شکوہ الفاظ، روانی وغیرہ ماسوا نازک خیالی کے اس دور کے قصیدوں میں ملتی ہیں۔

**مثنوی** اس دور کو اگر مثنوی کا دور کہا جائے تو مناسب ہے۔ مذہبی

فلسفیانہ ۔ صوفیانہ ۔ عاشقانہ ۔ رزمیہ ۔ بزمیہ ۔ بیانیہ ۔ غرض ہر طرح کی مثنوی اس عہد میں لکھی گئی اور حق یہ ہے کہ خوب لکھی گئی ۔ اگر اس عہد کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی و رسمی زندگی کا مطالعہ کرنا ہو تو اس دور کی مثنویوں سے بہتر اور کوئی ذریعہ واقفیت نہیں ہو سکتا ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی متفرق مثنویوں اور نصرتی کی مثنوی "علی نامہ" سے اس عہد کے متعلق جو واقفیت حاصل ہوتی ہے وہ کوئی بہتر سے بہتر تاریخ بھی مہیا نہیں کر سکتی ۔ اس لحاظ سے نیز ادبی لحاظ سے اس دور کی مثنویاں بہت گراں قدر ہیں ۔

**مرثیہ**

سلاطین عادل شاہی نے مجالس عزا کی ابتدا کی لیکن ان میں فارسی کے مرثیے پڑھے جاتے تھے ۔ سب سے اول شیخ شجاع الدین نوری نے اردو مرثیہ لکھا ۔ ان کے بعد مرثیہ گو شعراء کی کافی تعداد پیدا ہو گئی ۔ گویا مرثیہ کی ایجاد کا فخر بھی اسی دور کو حاصل ہے ۔ زبان کی صفائی اور روانی کے علاوہ جن جن خصوصیات کے لحاظ سے انیس اور دبیر خاتم مرثیہ سمجھے گئے وہ خصوصیات اپنی جملہ نظر فریبیوں اور دلچسپیوں کے ساتھ اس دور میں جلوہ فرما ہیں ۔ لیکن اپنی ابتدائی حالت میں ۔ جن خصوصیات نے انیس کو انیس اور دبیر کو دبیر بنایا وہ یہ ہیں ۔ جذبات نگاری ۔ سیرت نگاری ۔ مکالمہ کی ندرت ۔ محاکات کی لطافت وغیرہ ۔ ان کے علاوہ روایات کا نظم کرنا بھی ایک خاص جدت سمجھی جاتی ہے ۔ دکنی شعراء کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ سب خصوصیات نظر سے گزرتی ہیں ۔ اور لطف یہ ہے کہ سیرت نگاری میں جو مرقعے تیار ہوئے ہیں اُن میں دیسی رنگ بھی اسی دور

میں بھر اگیا ہے۔ متاخرین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے عربی کردار کو ہندوستانی بنا دیا۔ ہندوستانی پوشاک اسے پہنائی۔ ہندوستانی عادات واطوار، ہندوستانی رسم ورواج، ہندوستانی طرزِ گفتگو، غرض ہر حیثیت سے عربی خاکوں میں ہندی رنگ بھرا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ متقدمین ہی اس روش کو صاف کر گئے تھے۔ متاخرین تو محض مقلد ہوئے۔

غرض یہ کہ یہ ابتدائی دور ہر لحاظ سے ادوار مابعد کا مقدم اور پیش رو ہے۔ یہی نہیں بلکہ متوسطین اور متاخرین نے اسی دور کی قائم کردہ بنیادوں پر اپنی فلک بوس عمارتیں کھڑی کیں۔

# باب ۳

## ابتدائی دور شمالی ہند میں

**تمہید** شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد خاندان مغلیہ کا شیرازہ منتشر سا ہو گیا۔ بہادر شاہ نے تقریباً پانچ برس اور فرخ سیر نے چھ برس سکونت کی۔ لیکن اس گیارہ بارہ سال کے عرصے میں ملک کو چین نصیب نہ ہو سکا۔ محمد شاہ کے زمانے میں سادات کی قوت ٹوٹ گئی تو کچھ عافیت میسر آئی۔ اس عافیت کو اہلِ کمال نے غنیمت سمجھا اور چاروں طرف سے آکر پایہ تخت دہلی میں جمع ہو گئے۔ ہمیں یہاں صرف شعر وشاعری سے سروکار ہے لہٰذا انھیں لوگوں کے نام درج کیے جا سکتے ہیں جنھیں شعر وشاعری کا ذوق تھا۔ ان میں قزلباش خاں امید

سلیمان قلی خاں وداد - علی قلی خاں ندیم - شیخ سعد اللہ گلشن - مرتضیٰ قلی خاں فراق - میر شمس الدین فقیر - مرزا عبد القادر بیدل - سراج الدین علی خاں آرزو - ایسے صاحب فضل و کمال ہستیاں تھیں جن کی فارسی شاعری پر اگر وہ عہد ناز کرے تو بیجا نہیں۔

جیسا بیان ہوا ہے ارباب فن فارسی سے اپنی تیغ زبان کو جلا دیتے تھے۔ زبان اُردو کی طرف ان لوگوں نے توجہ نہیں کی۔ کیونکہ اس عہد میں اس زبان کو کچھ فروغ نہیں تھا۔ حکومت کی زبان فارسی تھی۔ اور فارسی دانی ہی علم و ہنر کی سند تھی۔ اگرچہ چند دکنی شعرا، مثلاً فراقی، فخری، آرزو وغیرہ دہلی آئے مگر زمانہ نے مساعدت نہیں کی اور انھیں واپس جانا پڑا۔ البتہ ولی اورنگ آبادی ۱۷۲۲ء میں دہلی آئے۔ اور کچھ عرصے قیام کر کے لوگوں میں اُردو شاعری کا ذوق پیدا کیا۔ ان کے اُردو کلام کی بڑی قدر ہوئی۔ قوالوں اور ارباب نشاط نے ان کی غزلیات سے محفلوں کو گرما دیا۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی اتنی قدر ہو لوگوں کے دلوں میں خود بخود اُس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دہلی میں اُردو مذاق عام ہو گیا۔ بڑے بڑے مشاق فارسی گو شعرا نے بھی اس میں طبع آزمائی کی۔ مگر اُن میں سے کسی نے اپنی شاعرانہ جد و جہد کو صرف اُردو ہی کے لئے وقف نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں اُردو شعرا کی صف میں کوئی جگہ نہیں دے سکتے۔ تاہم ولی اورنگ آبادی کے کلام کا اثر ظاہر کرنے کے لئے اگر اُن فارسی گو شعرا کے ایک ایک دو دو شعر لکھ دئے جائیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

قزلباش خاں اُمید کے دو شعر تذکروں میں ملتے ہیں :-

در و دیوار سے اب صحبت ہے     یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

مرزا عبدالقادر بیدل کے دو شعر نکات الشعرا میں درج ہیں :-

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

مرزا علی قلی خاں ندیم کے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں
بیقرار عشق کو ہے زندگی نقص کمال
مر چکے بیمار تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

سراج الدین علی خاں آرزو فارسی کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں انھیں بزم اُردو کے صدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور شعرا کی صف اولین میں نہایت ممتاز مقام پر انھیں بٹھایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں اُردو شعر و شاعری سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ جس طرح دیگر فارسی شعرا نے رفتار زمانہ کے ساتھ دو چار قدم چلنے کا ثبوت دیا ہے۔ اُسی طرح آرزو نے بھی چند اُردو اشعار کہہ کر اپنی خوش مذاقی اور اُردو کی ہر دلعزیزی کو مسلّم کیا ہے۔ چنانچہ چند اشعار آپ کے یہ ہیں :-

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے — چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں — زندگانی کا کیا بھروسا ہے

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے — بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

میخانے آج جا کر شیشے تمام توڑے — زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ محض تمہید تھی تاکہ اس عہد کے عام حالات اور فضا سے واقفیت ہو جائے۔ تمہید اگرچہ طویل ہو گئی لیکن کم از کم اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اُردو نے فارسی شعراء کے دلوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور کلام ولی نے اس ذوق و شوق میں اور جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں ایک گروہ ایسے شعراء کا پیدا ہو گیا جنہوں نے اُردو شعر و شاعری کو طرۂ امتیاز بنایا۔ شمال میں شعر و ادب کا ادبستان کھول دیا اور خود اس ادبستان کے معلم بنے۔ اِن میں سے چند قابل ذکر ہستیوں کے حالات زندگی اور نمونہ کلام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :-

## شاہ مبارک آبرو

آپ کا نام نامی نجم الدین عرف شاہ مبارک اور آبرو تخلص تھا۔ تاریخ ولادت ہنوز پردۂ راز میں ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ آپ کی ولادت گوالیار میں ہوئی۔ آپ کے دادا شاہ محمد غوث گوالیار کے مانے ہوئے بزرگ تھے۔ لڑکپن میں آبرو دہلی پہنچے اور فن شاعری کا اکتساب کیا۔ اگرچہ خان آرزو سے عمر میں بڑے تھے مگر اپنا کلام انھیں دکھا لیتے تھے۔ آرزو سے کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ آپ کچھ مدت نارنول میں بھی مقیم رہے۔ ایک آنکھ سے آپ معذور بھی تھے۔ ۱۱۷۵ھ میں اس جہان فانی

سے کوچ کیا۔

آبرو کی علمی قابلیت فن شعر کے لئے کافی تھی۔ آپ نے ایک دیوان غزلیات کا مرتب کیا تھا لیکن اب وہ نایاب ہے۔ کلام میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ غزلیات میں زیادہ تر ردیف کی قید نہیں ہوتی۔ قافیہ میں بھی آزادی برتتے ہیں اور یہی اس عہد کا رنگ ہے۔ آبرو کو ایہام اور ذو معنیین الفاظ کا بہت شوق ہے اور کلام کی بنیاد زیادہ تر اسی صنعت پر ہوتی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

نین سین نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا
تیرے چلنے کی سن خبر عاشق — یہی کہتا مُوا کہ ہائے گیا
آبرو ہجر بیچ مرتا تھا — مکھ دکھا کر اُسے جلائے گیا

---

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی
تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھک جھوروں کی
گانٹھ کاٹی ہے مرے دل کی تری انکھیاں نے
دو پلک نیں یہ کترنی ہے مگر چوروں کی
آبرو کو نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے نکتوروں کی

---

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا — دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا
تجھ راہ میں ہوا ہے اب تو رقیب کتنا — بو پائے کر ہماری آبا ندھتا ہے تاں کا
سب عاشقوں میں ہم کوں مژدا ہے آبرو کا — ہے قصد گر تمہارے دل بیچ امتحاں کا

---

**محمد شاکر ناجی** | شاہ مبارک آبرو نے ناجی کی شیرینیٔ زبان کی تعریف کی ہے :-

سخن سنجاں میں ہیگا آبرو آج
نہیں شیریں زباں شاکر سری کا

آپ محمد شاہ بادشاہ کے وزیر عمدۃ الملک امیر خاں کے داروغہ تھے۔ سن ولادت و وفات معلوم نہیں لیکن آبرو کے ہمعصر تھے۔ اور نادر شاہی حملہ کے وقت یعنی ۱۷۳۹ء میں نہ صرف زندہ تھے بلکہ محمد شاہی لشکر میں شامل تھے۔ دہلی دربار اور لشکر کی کیفیت ایک مخمس میں نظم کی ہے جس کا ایک بند ملاحظہ ہو :-

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے ۔۔۔ دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالی مزے سے پیتے تھے ۔۔۔ نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں بازو اُپر طلا کے نال

آپ کے کلام میں سادگی اور صفائی کے علاوہ ظرافت کی چاشنی اور شوخی کی ملاحت عجب مزا دیتی ہے۔ آپ کی طبیعت کا میلان ہزل گوئی کی طرف تھا۔ آبرو کی طرح ایہام و ذومعنیین الفاظ کا بھی شوق تھا اور اسی صنعت پر کلام کی بنیاد تھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

اے صبا کہہ بہار کی باتیں ۔۔۔ اس بُتِ گلعذار کی باتیں
کس پہ چھوڑے نگاہ کا شہباز ۔۔۔ کیا کرے ہے شکار کی باتیں
چھوڑتے کب ہیں نقد دل کو صنم ۔۔۔ جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں
دیکھ موہن تری کمر کی طرف ۔۔۔ پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف
جن نے دیکھے ترے لب شیریں ۔۔۔ نظر اُن کی نہیں شکر کی طرف

ہے محال اُن کا دام میں آنا دل ہے اُن سب بتاں کا زد کی طرف
حشر میں پاکباز ہے ناجیؔ بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

## شیخ شرف الدین مضمونؔ

شیخ شرف الدین نام مضمونؔ تخلص تھا۔ شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں تھے۔ آگرہ کے قریب موضع جاجمؤ میں پیدا ہوئے اور آغاز شباب میں دہلی چلے آئے اور پھر اُسی کو اپنا وطن بنایا۔ اور زینت المساجد میں درویشانہ زندگی بسر کی۔ خانِ آرزوؔ سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ ۱۷۴۵ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ مضمونؔ اس دور کے مسلم الثبوت اُستادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سودا اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:—

بنائیں اُٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمونؔ دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

آپ کا کلام آپ کی اُستادی اور مشاقی کو مسلّم کرتا ہے۔ آپ کے کلام میں استعارے کی چاشنی موجود ہے لیکن زمانہ کے اصلی رنگ یعنی ایہام اور مراعاۃ النظیر سے بھی کام لیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

کرے ہے دار کو کامل بھی سر تاج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج
ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا
کریں کیوں نہ شکر یوں کو مرید کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید
تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر آپ پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال
کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں

میرا پیغام وصل اے قاصد ۔۔۔ کہیو سب سے اُسے جدا کر کے
چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

محمد احسن احسن | محمد احسن نام ۔ احسن تخلص ۔ اسی ابتدائی دور کے مشہور شاعر تھے اُن کا کلام ایہام کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ ملاحظہ ہو:۔

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اُس شوخ دلبر سوں
کہ کر کر قول پہ سوں کا گیا برسوں ہوئے برسوں

لام نستعلیق کا ہے اُس بت خوشخط کی زلف ۔۔۔ ہم تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اسلام کے
نازک بدن پہ اپنے کرتے ہو تم جو غرّہ ۔۔۔ موسیٰ کمر نے تجھ کو فرعون سا بنایا

غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ | غلام مصطفےٰ خاں نام یکرنگ تخلص ۔ کہن سال اور کہنہ مشق شاعر تھے ۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے مشورۂ سخن کرتے تھے ۔ اپنے وقت کے خوش فکر، باکمال اور مشاق شاعر مانے جاتے تھے اور محمد شاہی اُمرا میں صاحبِ حیثیت تھے ۔ نمونۂ کلام یہ ہے :۔

زبان شکوہ ہے مہندی کا ہر پات ۔۔۔ کہ خوباں نے لگائے ہیں مجھے ہات
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے ۔۔۔ مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں
جدائی سے تری اے صندلی رنگ ۔۔۔ مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی ۔۔۔ ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا
سنتا نہیں ہے بات کسی کی تو اے سجن ۔۔۔ تجھ کو ترا غرور بجانوں کرے گا کیا
سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے ۔۔۔ راستی ہیگی دار کی صورت

## شاہ ظہور الدین حاتم

ظہور الدین نام۔ اور حاتم تخلص تھا۔ ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ عمدۃ الملک نواب امیر خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ سپاہی زادہ اور سپاہی پیشہ تھے لیکن دلّی میں قدم شریف کے قریب میر بادل علی شاہ کے تکیے میں اُٹھنے بیٹھنے سے طبیعت میں فقیری اور آزادہ مشی پیدا ہو گئی تھی۔ شعر و شاعری کا ذوق ابتدائے عمر ہی سے تھا۔ پہلے رمزؔ تخلص کرتے تھے پھر حاتمؔ تخلص کرنے لگے۔ کلیات اِن کا بہت بڑا ہے جو غزلیات، قصائد، رباعیات، مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے لیکن آپ نے خود اس کلیات کا انتخاب کیا اور اِس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔ یہ بھی کافی ضخیم کتاب ہے "دیوان زادہ" پر جو آپ نے دیباچہ لکھا ہے۔ اُس سے آپ کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ دیباچہ کی عبارت فارسی ہے۔ یہاں اُس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

میں نے ۱۱۲۹ھ سے ۱۱۶۹ھ تک، یعنی چالیس سال تک سرزمین شاعری کی سیاحت کی ہے۔ فارسی میں پیروِ صائبؔ ہوں اور اُردو میں وَلی کو اُستاد سمجھتا ہوں۔ دیوان قدیم نادرشاہی حملے سے قبل ہند میں مشہور تھا لیکن سنہ ۳ جلوس عالمگیر ثانی میں اس دیوان کا خلاصہ کیا اور "دیوان زادہ" اُس کا نام رکھا۔

میرے معاصر شاہ مبارک آبروؔ۔ شرف الدین مضمونؔ۔ مرزا جانجاناں مظہرؔ شیخ احسن اللہ احسنؔ۔ میر شاکر ناجیؔ۔ غلام مصطفےٰ یکرنگؔ ہیں۔

میں نے لفظ در، بر، از اور اِسی قسم کے دیگر الفاظ و افعال ترک کر دئے۔ اور روزمرّہ دہلی کو روا رکھا۔ مخصوص ہندی اور بھاکا الفاظ کو بھی متروک قرار دیا۔ لیکن روزمرّہ اور عام فہم اور پسندیدہ الفاظ کو برقرار رکھا۔ "تسبی" بجائے "تسبیح"

اور 'صحی'، بجائے 'صحیح'، 'بگانہ'، بجائے 'بیگانہ' اور 'دوانہ' بجائے 'دیوانہ'
وغیرہ الفاظ کا استعمال ناجائز ٹھہرایا۔ اسی طرح ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن
باندھنا ترک کیا وغیرہ وغیرہ۔"

اسی دیباچہ کے آخر میں اپنے شاگردوں کی فہرست بھی درج کی ہے۔
جن کی تعداد ۴۵ ہے۔ انھیں شاگردوں میں مرزا محمد رفیع سودا کا نام بھی ہے۔

حاتم ۱۷۹۱ء میں بمقام دہلی راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

حاتم کا مرتبہ بہ حیثیت استاد کے مسلّم ہے اور آپ کی خدمات زبان
وقیع۔ سودا جیسے شاعر آپ کے دامنِ فیض میں تربیت پاکر اپنے وقت کے
مسلّم الثبوت استاد ہوئے۔ حاتم نے اپنے کلام میں فصاحت اور زبان کی صفائی
کو بہت اہمیت دی۔ لیکن افسوس یہ کہ اُن کی اصلاحات پر اُن کے عزیز ترین
شاگرد یعنی سودا نے بھی عمل نہ کیا۔ میر اور سودا کے یہاں کثرت سے وہی الفاظ
پائے جاتے ہیں جن کو حاتم نے ترک کر دیا تھا۔ البتہ اُن اصلاحات سے
آگے چل کر ناسخ نے فائدہ اُٹھایا۔ اور زبان اُردو کو اکثر ناہمواریوں سے
پاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔

حاتم کے کلام میں ایہام بہت کم پایا جاتا ہے لیکن اس سے یہ مطلب
نہیں کہ آپ نے اِس تکلف کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا ہو۔ اِس جہاد کا فخر
مرزا مظہر کو حاصل ہے۔ تاہم حاتم کے کلام کا اصلی جوہر سادگی، بے تکلفی
اور بے ساختہ پن ہے۔ جو کچھ دل پر گزرتا ہے بے تکلف کہہ دیتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے     شوخ ظالم ہے اور ستمگر ہے

دیکھ سروِ چمن ترے قد کوں — خجل ہے پا بگل ہے بے بر ہے
حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن — قند ہے، نیشکر ہے، شکر ہے
کیوں نہ سب سے تجھے چھپا رکھوں — جان ہے، دل ہے، دل کا انتر ہے
مارنے کو رقیب کے حاتم — شیر ہے، ببر ہے، دحضتر ہے

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا — مانندِ خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند — جرّاح زخم عشق کا آکر سیا تو کیا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی — کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک — تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر — سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

**اشرف علی خاں فغاں** | اشرف علی خاں المتخلص بہ فغاں احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ اور علی قلی خاں ندیم کے شاگرد تھے۔ میر تقی میر نے انھیں قزلباش خاں اُمید کا شاگرد لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے اُمید کے شاگرد ہوں اور پھر ندیم سے فیض اُٹھایا ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

دشتِ جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا — اب تو فغاں ندیم مرا رہنما ہوا

"اب تو" کے ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ پہلے اِن کا "رہنما" کوئی اور تھا۔ اور غالباً وہ "رہنما" اُمید تھے۔

فغاں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یگانۂ روزگار تھے۔ چنانچہ احمد شاہ نے اُن کی طبیعت کی مناسبت سے ظریف الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔

احمد شاہ درّانی کے حملوں سے دہلی میں ابتری پھیل رہی تھی۔ فغاں اِس

غیر مستقل حالت سے گھبرا کر اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد پہنچے۔ چندے وہاں قیام رہا۔ پھر مرشد آباد کا قصد کیا۔ نواب شجاع الدولہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا۔ پریشان حالی نے تو ساتھ چھوڑ دیا مگر نازک مزاجی یہاں بھی جان و دل کے ساتھ تھی۔ ایک روز نواب صاحب نے جوشِ اختلاط میں بقول مصحفی گرم پیسے سے اُن کا ہاتھ جلا دیا۔ یہ آگ بگولا ہو گئے اور طیش میں آکر عظیم آباد چلے گئے۔ وہاں راجا شتاب رائے نے اُن کی قدر و منزلت کی۔ آپ وہیں مقیم ہوئے اور آخر وقت تک وہیں رہے۔ اور وہیں ۱۷۷۲ء میں پیوندِ خاک ہوئے۔

مولانا محمد حسین آزاد آبِ حیات میں فرماتے ہیں کہ آخر وقت میں فغاں سے اور راجہ صاحب سے بھی شکر رنجی ہو گئی۔ اور انھوں نے حکام فرنگ تک رسائی پیدا کر کے باقی عمر فارغ البالی اور خوش حالی میں گزاری۔

فغاں کی زبان وہی ہے جو اس عہد کے دیگر شعرا کی ہے مگر کلام میں صفائی زیادہ ہے۔ ایہام بھی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ باتیں سیدھی سادی ہیں۔ لیکن بے ساختہ پن سے تاثیر میں ڈوبی ہوئی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں — لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
بادِ صبا تو عقدہ کشا اس کی ہو جیو — مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں
اتنا و فورِ خوش نہیں آتا ہے اشک کا — عالم کو مت ڈبو ئیو اے چشمِ تر کہیں
میری طرف سے خاطرِ صیاد جمع ہے — کیا اُڑ سکے گا طائرِ بے بال و پر کہیں
تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے — ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں

رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا | مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں
باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے | آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

# تبصرہ

**زبان** | بہت سے قدیم دکنی الفاظ جو بحری اور ولی کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں وہ شمالی ہند کے اس ابتدائی دور میں نہیں ملتے۔ اور یہ قدرتی بات ہے۔ دکن میں اردو نے زیادہ تر ہندی، دکنی، مرہٹی وغیرہ زبانوں سے بہنا پا کیا اور اُن کے الفاظ قبول کئے۔ شمالی ہند میں، برج بھاشا اور فارسی کے دامن میں پلی۔ اس دور کی تمہید میں جو فارسی شعراء کے اردو اشعار درج ہوئے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اردو پر فارسی رنگ کس قدر غالب تھا۔ اس دور کے جتنے شاعر استاد ہوئے وہ سب یا تو خود فارسی داں تھے یا فارسی داں استادوں کے شاگرد۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام پر فارسی رنگ چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

حاتم نے زبان کو پاک و صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ یعنی انھوں نے اپنے کلّیات کے انتخاب میں ایسے اشعار نکال ڈالے جن میں ثقیل خلاف روزمرہ اور ٹھیٹ ہندی الفاظ تھے یا قافیہ کا کوئی سقم تھا یا کوئی فارسی لفظ غلط مستعمل

تھا۔ انھوں نے اِن متروکات پر کسی سے عمل نہیں کرایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اِن کے مخز اُستاد شاگرد کے کلام میں بھی اِن کے متروکات کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

**اصنافِ سخن** | یوں تو اِس دَور میں قصیدہ بھی لکھا گیا اور مثنوی بھی۔ مگر اصلی کارنامہ اِس دَور کا غزل ہے۔

**شاعری** | سطورِ گذشتہ میں بیان ہوا کہ زبان اور طرزِ بیان پر فارسیت غالب ہے۔ لیکن عجب اتفاق ہے کہ ہندی دوہروں کی ایک خصوصیت نے اِس دَور کی غزلوں پر اپنا سکّہ جمایا۔ یعنی ایہام و ذو معنین الفاظ کا استعمال خوب ہوا۔ اگر اعتدال سے اِس صنعت کو برتا جائے تو حُسن ہے۔ لیکن اس دَور میں شاعری کی بنیاد زیادہ تر اِسی پر رکھی گئی۔ اور اِس صنعت کی خاطر تکلّف اور آورد سے کام لیا گیا۔ اگر اِس دَور کو ایہامی دَور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اِس تکلّف سے قطعِ نظر خیالات میں سادگی ہے۔ صاف وسادہ باتیں ہیں اور بعض جگہ نری باتیں ہی باتیں ہیں۔ وَلی کے خاص رنگ یعنی بھاشا شاعری کے جذبات نے اِس دَور میں فروغ نہیں پایا۔ شعراء نے وَلی کی تقلید نہیں کی بلکہ فارسی کی تقلید کرکے دیسی چیز کو پردیسی بنادیا۔

**نتیجہ** | دکن کے ابتدائی دَور سے شمالی ہند کے ابتدائی دَور کا پلّہ ہر حیثیت سے ہلکا ہے۔ کیا بلحاظ اصنافِ سخن۔ کیا بلحاظ نفسِ شاعری ہر لحاظ سے دکنی دَور کو فوقیت حاصل ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان نے نسبتۃً ترقی کی۔ حاتم کی کوششیں گو اس دَور میں بارآور نہ ہوئیں۔ تاہم ایک راہ نکل گئی۔ اگلی نسل کے لوگ اِسی راہ پر چل کر مصلحِ زبان کہلائیں گے۔

آخر میں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ اس دور کے شعرائے کلام میں پُر تاثیر اور مؤثر اشعار جا بجا ملتے ہیں۔ اور اس قسم کے اشعار دکنی دور کے بہترین اشعار کے مقابلے ہی پر نہیں بلکہ ہر آیندہ دور کے عمدہ اشعار کے مقابلے پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ بلند خیالی نہیں ہے تاہم فطری اندازِ بیان کی بدولت ان اشعار میں بے پناہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

# باب ۴

# اُردو شعر و شاعری کا دوسرا دور

## عہدِ زرّیں

**حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ** زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ ۱۶۹۸ء میں بمقام کالا باغ (مالوہ) کتم عدم سے عالم وجود میں تشریف لائے۔ آپ کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے دربار میں منصب دار تھے۔ شہنشاہ ان دنوں دکن میں فوج کی کمان کر رہا تھا۔ مرزا جان اُس کے ہمراہ تھے۔ جب مرزا مظہر کی ولادت کا حال معلوم ہوا تو اورنگ زیب نے فرمایا "پسر جانِ پدر می باشد" اس لئے ہم نے اُس کا نام جانِ جاں رکھا۔ کثرتِ استعمال سے جان جاناں ہو گیا۔

حضرت مظہر کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے محمد بن حنیفہؓ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی شاہی دربار میں

منصب دار تھے۔ دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ اِن رشتوں کے لحاظ سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔

مرزا مظہر کے رشتۂ حیات میں ابھی کل اٹھارہ ہی گرہیں لگی تھیں کہ باپ نے وفات پائی اور آپ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ اُن کا منصب حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن بخت کی سعادتمندی نے دنیا سے جی اُچاٹ کر دیا۔ مدرسوں اور خانقاہوں کی جاروب کشی شروع کی۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے جو اُس زمانہ میں شیخ المحدثین تھے باقاعدہ حدیث پڑھی اور تیس برس تک مشائخ نقشبندی سے کسبِ کمال کیا اور صاحبِ حال و قال بزرگ ہو گئے۔

آپ کی طبیعت میں سنجیدگی اور متانت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ خوش تقریر اس بلا کے تھے کہ بات کرتے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ مزاج میں لطافت اور طبع میں سلامتی تھی۔ میر تقی اُن سے ملے تھے "نکات الشعراء" میں لکھا ہے کہ "بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است . . . خوش تقریر بمرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد" انشاءاللہ خاں انشاؔ نے بھی "دریائے لطافت" میں آپ کی فصاحت و بلاغت کا ذکر کیا ہے۔ استغنا اور قناعت طبیعت میں اس درجہ تھی کہ عمر بھر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سرِ نیاز خم نہیں کیا۔ بادشاہوں اور امیروں نے اکثر پیشکش اور نذر و نیاز کے لئے دستِ داد و دہش بڑھایا۔ مگر اُن کے استغنا کا ہاتھ ہمیشہ زیرِ دامن ہی رہا۔ نہایت سادہ زندگی بسر

کرتے تھے۔ زندگی بھر کہیں مکان نہیں بنایا۔ کسی دوست کے گھر یا کرایہ کے
مکان میں عمر بسر کردی۔ ایک جوڑے سے زیادہ کپڑا نہ رکھتے تھے۔ جب بھوک
لگتی بازار سے منگواتے اور کھاتے۔ عام دعوتوں کو قبول نہ فرماتے تھے۔ نہ عرس
کرتے تھے نہ فاتحہ۔ روپے پیسے کی ضرورت ہوتی تو کیونکر۔

ساتویں محرم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص آیا۔ دروازہ بند تھا۔
اُس نے آواز دی۔ باہر نکلے تو ایک قرابین ماری۔ وہ تو بھاگ گیا مگر حضرت
کو زخم کاری لگ چکا تھا۔ تین دن زندہ رہے۔ دس محرم ۱۱۹۵ھ مطابق
۱۷۸۱ء کو اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ اور شہدائے کربلا کی خدمت میں
جا حاضر ہوئے۔ سوداؔ نے جب شہادت کی خبر سُنی تو تاریخ کہی۔

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتد شوم     اور اُن کی ہوئی خبر شہادت کی دھوم
تاریخ از روئے درد یہ سُن کے کہی     سوداؔ نے کہ ہائے جانِ جاناں مظلوم
۱۱۹۵ھ

آپ کا ایک مختصر فارسی دیوان موجود ہے۔ اُردو دیوان بھی مرتب کیا
تھا مگر نایاب ہے۔ اُردو شعر و ادب کے ارتقا میں آپ کا مرتبہ بہت بلند
ہے۔ تمام تذکرہ نویس مثلاً قدرت اللہ صدیقی، مصحفی وغیرہم متفق الرائے
ہیں کہ مظہر نے اُردو شاعری کے دامن کو ایہام کے بدنما داغ سے پاک کیا۔
سید انشا آپ کی فصاحت و بلاغت کی شہادت دیتے ہیں۔ آپ کا کلام
درد اور کیف کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ زبان نہایت شستہ اور روزمرہ
کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ تصوف کی چاشنی نے جذبات کو بلند اور موثر کیا ہے۔

مرزا مظہر کا فیض شاعری بھی کچھ کم نہیں۔ بہت سے خوش مذاق موزوں طبع آپ کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر صاحبِ دیوان اور اُستاد ہوئے۔ ان میں سے انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، خواجہ احسن اللہ خاں بیاںؔ مصطفےٰ خاں یکرنگ (دورِ اوّل کے شاعر)، بساون لال بیدار، ہیبت قلی خاں حسرت محمد فقیہ درد مند کے نام دنیائے شاعری میں مہر و ماہ کی طرح چمکتے ہیں:۔

اب مرزا صاحب کے کلام سے لطف اُٹھائیے:۔

چلا اب گُل کے ہاتھوں سے لُٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گُل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گُل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولتخواہ اپنا مظہر اپنا جانِ جاں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

شاخِ گُل ہلتی نہیں پر بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھ سب
پھر اُنھیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

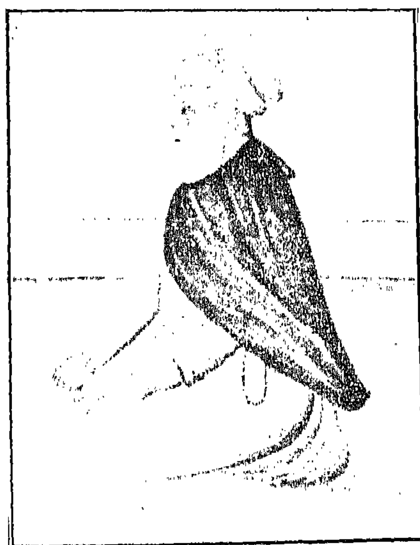
**مرزا محمد رفیع سودا**

مرزا محمد رفیع نام۔ سودا تخلص۔ مرزایانِ کابل سے تھے۔ اِن کے والد محمد شفیع بغرض تجارت ہندوستان آئے اور یہیں بودوباش اختیار کرلی۔ مرزا رفیع ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت و پرورش پائی۔ رسم زمانہ کے بموجب پہلے سلطان قلی خاں وداد کے شاگرد ہوئے۔ خانِ آرزو کے شاگرد نہ تھے لیکن اُن کی صحبت سے بہت فیض پایا تھا۔ شاعری کی ابتدا فارسی سے کی مگر خانِ آرزو کے کہنے سے اُردو میں کہنا شروع کیا اور شاہ حاتم کو اپنا اُستاد بنایا۔ طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلی جیسے شہر میں اُن کی اُستادی مسلم الثبوت ہوئی۔ اُستاد کی زندگی ہی میں وہ شہرت حاصل ہوئی کہ خاص و عام میں اُن کے کلام کا چرچا ہونے لگا یہاں تک کہ شاہ عالم اپنا کلام اصلاح کے لیے اُن کو دینے لگے۔

مرزا بڑے نازک مزاج اور غیور طبع واقع ہوئے تھے۔ کہتے ہیں شاہ عالم سے کسی بات پر ناراض ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ ہر چند بادشاہ نے بلوایا مگر نہ گئے۔ دہلی کے اکثر امرا بڑی قدردانی کرتے تھے۔ اور اِس قدردانی کی بدولت فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔

مرزا کا شہرہ جب لکھنؤ پہنچا تو نواب شجاع الدولہ نے سفر خرچ بھیج کر بکمال اشتیاق لکھنؤ بُلایا۔ مرزا سے دہلی نہ چھوڑی گئی۔ جواب میں یہ رباعی بھیج کر معذرت چاہی :—

سوداؔ پئے دنیا تو بہر سو کب تک     آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اِس سے نہ کہ دنیا ہووے     بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک



مرزا سودا

دہلی کی سیاسی حالت ابتر تھی۔ امرا رحال سے بے حال ہوتے جاتے تھے۔ آخر جب شاہ عالم کا کھیل بگڑا۔ امرار کے دَور دَورے ختم ہوگئے اور بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو بادلِ ناخواستہ وطن کو خیرباد کہا۔ کچھ دنوں فرخ آباد قیام کیا۔ اس کے بعد فیض آباد پہنچے۔ اُس وقت اُن کا سن ساٹھ برس کا ہو چکا تھا۔ نواب شجاع الدولہ برسرِ حکومت تھے۔ وہ بہت عزّت سے پیش آئے اور اُن کی تنخواہ مقرر کردی۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو اُنھوں نے لکھنؤ کو پایۂ تخت بنایا۔ مرزا بھی اُن کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے اور جب تک جیتے رہے شاہی قدردانی کی بدولت فارغ البال رہے۔ آخر وہیں ۱۷۸۱ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کے اُستاد شاہ حاتم زندہ تھے سُن کر بہت روئے اور کہا کہ ہمارا پہلوان سخن مرگیا۔ مصحفی نے تاریخ کہی۔ ع

سوداؔ کجا و آں سخنِ دلفریب او

سوداؔ اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ جملہ اصنافِ سخن پر قدرتِ کاملہ رکھتے تھے۔ اُن کا کلّیات ہر جگہ ملتا ہے۔ اُس میں غزلوں کے علاوہ قصائد۔ رباعیات۔ قطعات۔ مخمّس۔ ترجیع بند۔ مستزاد۔ مثنویات۔ سلام۔ مراثی وغیرہ شامل ہیں۔

سوداؔ کو زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔ مضمون کو جس طرح چاہتے ہیں باندھتے ہیں۔ اور پھر الفاظ ایسے انتخاب کرتے ہیں کہ مضمون میں جدّت کے ساتھ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن خوش مذاقی کے ساتھ۔ عاشقانہ مضامین میں سادگی جذبات اور صفائی بیان

سے تاثیر کے نشتر بھرے ہیں۔ کلام میں متانت ہے۔ سوز و گداز بھی ہے۔
لیکن اس میدان میں میر سے پیچھے ہیں۔

مرزا قصیدے کے بادشاہ ہیں یوں تو اُن سے قبل بھی قصیدے لکھے گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اُردو قصیدے کو فارسی قصیدے کا ہم پلہ بنا دیا۔ مشکل سے مشکل زمین کو اپنی فصاحت و بلاغت، نشست الفاظ اور بندش کی چستی سے دلآویز اور شگفتہ بنا دیتے ہیں۔ اور متانت بیان، پختگیٔ کلام، زور الفاظ، علو تخئیل، اور ندرت و جدت سے زمین قصیدہ کو آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔

سودا کے کلّیات میں متعدّد ہجویں بھی شامل ہیں۔ جو مرزا کی نازک مزاجی اور تیزیٔ طبع پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مشاقی اور قادر کلامی بھی اُن سے ٹپکی پڑتی ہے۔ واقعات کو اس بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں کہ دوسرا شخص شاید نثر میں بھی اس سے بہتر ادا نہ کر سکے۔ جہاں پاکیزہ تمسخر اور شائستہ مذاق ہے۔ وہاں اُن کی ہجویں بہت پُر لطف ہیں۔ لیکن جہاں کہیں انھوں نے طیش میں آکر اور آنکھیں بند کر کے لکھا ہے وہاں کا نقشہ کچھ اور ہے۔ عامیانہ پن بھی ہے اور ابتذال بھی۔

مرزا نے زبان اُردو کو پاک و صاف کر کے اُسے ترقی دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اُردو میں فارسی محاوروں کو اس طرح کھپایا ہے کہ وہ آج تک ہماری زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔۔۔

مقدور نہیں اُس کے تجلّی کے بیاں کا | جوں شمع سراپا ہو اگر حرف زباں کا
پردے کو تعیّن کے درِ دل سے اٹھادے | کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن | جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا
دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار | لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمّت کے سُنے تو | مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی | اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
دل اُس نے لیا مجکو ملی دولتِ دیدار | کیا لوٹ کا سامان اُدھر بھی ہے اِدھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ | کافی ہے تسلّی کو مرے ایک نظر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے | یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

**میر محمد تقی میر**

میر محمد تقی نام ۔ میر تخلص تھا۔ اُن کے والد میر محمد علی شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ میر بمقام آگرہ ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ آپ دہلی چلے آئے۔ یہاں اُن کی بہن میر محمد حسین کلیم سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی تھیں اور اُن کے لحاظ سے کلیم کو بھی میر سے محبت تھی۔ اِن کے علاوہ خان آرزو بھی میر کے رشتہ میں ماموں ہوتے تھے۔ میر نے نکات الشعراء

میں اُن کا ذکر بہت محبت اور ادب سے کیا ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے یہاں ہر مہینہ کی پندرھویں کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ میر بھی اُس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اور خواجہ میر درد سے بہت خلوص تھا۔ لیکن انقلاباتِ زمانہ سے مشاعرہ کا یہ سلسلہ خواجہ میر درد کے یہاں درہم برہم ہوگیا۔ اور پھر مشاعرہ اُن کے ایما سے میر تقی کے یہاں ہونے لگا خواجہ صاحب بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔

سلطنت کی تباہی میں میر بھی پریشان حال تھے لیکن ثابت قدمی سے جمے بیٹھے تھے۔ آخر وہ زمانہ بھی آگیا کہ ناچار وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کا دور دورہ تھا۔ میر صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر ایک قصیدہ حالیہ لکھا۔ نواب صاحب نے ازراہِ قدردانی تین سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ جو مرتے دم تک اُن کو ملتا رہا۔

آبِ حیات میں لکھا ہے کہ جب میر صاحب لکھنؤ پہنچے تو ایک سرائے میں قیام کیا۔ اُس دن کہیں مشاعرہ تھا۔ اُسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ اُن کی قدیمانہ وضع دیکھ کر لوگ ہنسنے لگے میر بہت دلتنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب شمع اُن کے سامنے آئی تو بعض اصحاب نے پوچھا۔ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزلِ طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا     ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفوِ تقصیر چاہی۔ میر صاحب ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی۔ ع

واویلا مرد شہ شاعراں

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں میر صاحب کی بددماغی اور نازک مزاجی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے لیکن اس کی حقیقت سُنے سُنائے افسانوں سے زیادہ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کے مزاج میں استغنا اور قناعت تھی۔ طبیعت کو درویشی کی لٹک اور تصوّف کی چمک نے جِلا دی تھی۔ اور یہ اُن کی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ اُن کے والد نے انھیں جو باتیں تعلیم کی تھیں وہ نکات الشعرا میں درج ہیں۔ اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو دنیا داری سے کچھ سروکار نہ تھا۔ آپ کے مزاج میں انصاف بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آپ عمدہ اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے اور صاحبِ کمال کے اصلی جوہر کو پرکھتے تھے۔ نہایت مہذب، زندہ دل۔ یارباش۔ وضعدار آدمی تھے۔ میانہ قد۔ لاغر اندام۔ گندمی رنگ۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے تھے۔ بات کم کرتے تھے۔ اور وہ بھی آہستہ آواز میں۔ نرمی اور ملائمت کے ساتھ۔ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ و متین۔ ہر وقت محویت کا عالم طاری۔ اپنے خیالات میں ڈوبے رہتے تھے۔

میر صاحب کی تصانیف میں چھ دیوان ہیں۔ اُن میں جملہ اصنافِ سخن مثلاً قصیدے، مثنویات، مراثی وغیرہ شامل ہیں۔ واسوخت آپ نے ایجاد کیا۔

چنانچہ دو واسوخت بھی آپ کے کلام میں شامل ہیں۔ علاوہ بریں ایک تذکرہ "نکات الشعراء" فارسی میں لکھا ہے۔

میرؔ صاحب غزل کے بادشاہ ہیں۔ قصیدے کے مرد میدان نہیں۔ یہ سوداؔ کا حصّہ ہے۔ اُردو میں میرؔ صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے۔ اُردو میں جس قدر بڑے بڑے شعراء میرؔ کے بعد ہوئے اُن سب نے میرؔ کی اُستادی کا اعتراف کیا ہے۔ ناسخؔ فرماتے ہیں۔ ؏

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

غالبؔ بھی ناسخؔ کے ہم زبان ہیں۔ ذوقؔ فرماتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یہ حقیقت ہے کہ رنگ تغزّل کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے میرؔ نے برتا اُس کی مثال اُردو باوجود اس ترقی کے اب تک پیش نہ کر سکی۔ سوز و گداز، شیرینی، ملاحت، صداقت جذبات، وغیرہ غزل کی خصوصیات ہیں۔ اور یہ خوبیاں کلام میرؔ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ عشق کی واردات کو اس حُسن و صداقت سے بیان کرتے ہیں کہ تاثیر کی رورگ و ریشہ میں دوڑ جاتی ہے۔ میرؔ کے بہتّر اور دو بہتّر نشتر مشہور ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر الگ الگ اشخاص ان نشتروں کو انتخاب کریں تو بہت کم اشعار ایسے بچیں گے جو نشتر نہ ہوں۔

مثنوی میں بھی میرؔ کا مرتبہ خاصا بلند ہے۔ اگرچہ میرؔ حسنؔ نے اس صنف کو معراجِ کمال پر پہنچایا تاہم میرؔ کی مثنویوں میں بھی سوز و گداز اور واردات عشق کی گرمی کم نہیں۔ البتہ اُن سے منظر نگاری نہ نبھ سکی۔ یہ چیز

میر حسن کے حصے میں آئی۔ میر کی مثنویاں چھوٹی چھوٹی ہیں اور اُن میں ڈرامائی عنصر پایا جاتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

تھا مستعار حُسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
اک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

## خواجہ میر درد علیہ الرحمہ

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الرشید تھے۔ گیارہ واسطوں سے اُن کا نسب خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ اور پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ خواجہ میر ۱۷۱۹ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور والد کے آغوش تربیت میں پرورش پائی۔ والد کی طرف سے شاعری اور استغنا وراثت میں پایا۔ بائیس سال کی عمر میں دنیا سے منھ موڑا اور والد کے سجّادہ پر بیٹھ گئے۔

دہلی کا نقشہ بگڑا۔ امرا اور شرفا شہر چھوڑ چھوڑ کر دشت غربت میں گامزن ہوئے۔ اکثر شعرا نے فیض آباد اور لکھنؤ کا رُخ کیا مگر درد کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔ اللہ پر توکّل تھا اور جو سجّادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اُس پر قناعت کا پہلو جمائے بیٹھے رہے۔

تصوّف اور موسیقی میں بڑی مہارت تھی۔ شاعری کا شوق ابتدا سے

تھا۔ ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو اپنے یہاں محفل سماع منعقد کیا کرتے تھے۔ اُن محفلوں میں علماء و مشائخ کے علاوہ شاہ عالم بادشاہ بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ ہر مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے۔ میر تقی میر سے دوستانہ تعلقات تھے۔

خواجہ صاحب نے ۱۱۹۹ھ میں رحلت فرمائی۔ دہلی میں ترکمان دروازہ سے باہر آپ کا مرقد زیارتگاہ خاص و عام ہے۔

خواجہ صاحب کی تصانیف تین ہیں۔ ایک اسرار الصلوٰۃ۔ یہ رسالہ پندرہ برس کے سن میں مکمل ہوا۔ دوسری تصنیف واردات درد انیس برس کی عمر میں تکمیل کو پہنچی۔ تیسری تصنیف دیوان اُردو ہے۔ یہ سب تصانیف چھپ چکی ہیں۔

بحیثیت شاعر خواجہ صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ کا دیوان مختصر ہے۔ بجز غزلیات و رباعیات اور کچھ نہیں۔ غزلیات بھی مختصر ہیں۔ سات یا نو اشعار سے زیادہ کوئی غزل نہیں۔ لیکن انتخاب، میر حسن فرماتے ہیں کہ "دیوانش اگرچہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب" آزاد فرماتے ہیں کہ "خواجہ میر درد کی غزل سات شعر یا نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں۔ گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔ خیالات اُن کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو میں زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا اُردو میں آجتک کسی سے نہیں ہوا" خواجہ صاحب کے کلام کی تنقید اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ہم البتہ اس قدر

کہنے کی جرأت اور کرتے ہیں کہ جہاں تک غزلیات کا تعلق ہے خواجہ صاحب کا کلام میرؔ و سوداؔ کے کلام سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ بلکہ تصوّف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے کلام میرؔ و مرزاؔ سے زیادہ دلآویز ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا — ہم سبھی مہماں تھے یاں اک توہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں — آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دلِ خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث مت سابقی کو یاد کر
دردؔ یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ — کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں — کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں — ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں — کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے — اِدھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم — کُھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے دردؔ درپے ہو اُس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

## میر غلام حسن حسن

میر غلام حسن نام ۔ حسن تخلص ۔ میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے ۔ بمقام دہلی ۱۷۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کے سن میں والد کے ہمراہ فیض آباد آئے ۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ پہنچے اور وہیں رہے۔

پہلے اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے ۔ لیکن لکھنؤ پہنچ کر میر ضیاالدین ضیا کے شاگرد ہوئے ۔ اُن کا رنگ جب موافق طبع نہ پڑا تو خواجہ درد، میر تقی میر اور سودا کا تتبع کیا۔

حسن ۱۷۸۶ء میں اِس جہان فانی سے رخصت ہوئے ۔ مصحفی نے "شاعرِ شیریں زبان" سے تاریخ نکالی۔

آپ کی تصانیف میں ایک دیوان ۔ متعدد مثنویاں اور ایک تذکرہ شعرائے اُردو بزبان فارسی ہے۔

غزل میں حسن کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ درد کے تتبع سے کلام میں تصوف اور روحانیت کی چاشنی پیدا ہو گئی ہے ۔ سوز و گداز بھی کم نہیں ۔ صفائی اور محاورے کا لطف عام طور پر آپ کے کلام میں پایا جاتا ہے ۔ دیوان میں قصائد بھی ہیں لیکن رتبہ میں غزلوں سے بہت کم ہیں۔

حسن نے کل گیارہ مثنویاں لکھیں ۔ جن میں "گلزار ارم"، "رموز العارفین" "سحر البیان" زیادہ مشہور ہیں ۔ اور ان میں بھی "سحر البیان" کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ آجتک کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی ۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہ حسن کے باقی تمام کلام پر چھا گئی ہے اور

اب میر حسن مصنف سحر البیان کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ غزل گو کی حیثیت سے اُن کی شہرت نہیں۔

مثنوی سحر البیان میں بے نظیر اور بدرِ منیر کا قصّہ نظم ہوا ہے۔ قصّہ بھی شاعر ہی کے حسنِ تخیل کی ایجاد ہے۔ قصّہ کی دلآویزی مثنوی کی شہرت کا باعث نہیں۔ اس کی شہرت کا راز اس کی سحر بیانی ہے۔ سادگی، صفائی اور برجستگی جو ہر عمدہ نظم کے لوازمات ہیں، اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اول تو بحر بہت رواں اختیار کی ہے۔ اس پر بیان اور طرزِ ادا کی رنگینی نے شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ زبان ایسی صاف اور شستہ استعمال ہوئی ہے کہ آجکل کی زبان سے زیادہ قدیم معلوم نہیں ہوتی۔ اِن خوبیوں کے ساتھ جب جذبات کی ترجمانی، کردار نگاری، منظر نگاری، مصوری، واقعہ بندی کو دیکھا جائے تو یہ مثنوی ادبی حیثیت سے اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔ یہ مثنوی مقامی حالات، وقتی کیفیات، رسم و رواج اور طریقہ بود و باش کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مثنوی چھپ چکی ہے۔ اور ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے اور آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

غزلیات سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:—

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو — حسن تجھکو کیا رات غم تھا کسی کا

میں محشر کو کیا روؤں کہ اُٹھ جانے سے تیرے — برپا ہوئی اک گھر پہ قیامت تو ہیں اور

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا — کھڑا اُس پہ میں جان وارا کیا

ابھی دل کو لے کر گیا میرے آہ     وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
قمارِ محبت میں بازی سدا     وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسن اُس نے احساں دوبارا کیا

عیش و وصال و صحبتِ یاراں فراغِ دل     اس ایک جان کے لئے کیا کیا نہ چاہیئے
اظہارِ خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد     ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

**سید محمد میر سوز** | سید محمد میر نام۔ سوز تخلص۔ میر ضیاء الدین کے بیٹے تھے۔ ۱۷۲۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ شاہ عالم کے عہد میں جب دہلی پر تباہی آئی تو سوز نے فرخ آباد کا رُخ کیا۔ اور وہاں نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں کچھ دنوں زندگی بسر کی۔ اس کے بعد لکھنؤ پہنچے مگر رنگ نہ جما مرشد آباد کا قصد کیا لیکن وہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی۔ پھر لکھنؤ واپس آ گئے۔ اس مرتبہ تقدیر نے زور کیا۔ نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہو گئے۔ چند روز آرام سے نہ گزرے تھے کہ ۱۷۹۸ء میں سفرِ آخرت پیش آیا۔

میر سوز کی علمی قابلیت لوازمات شاعری کو نبھانے کے لئے کافی تھی۔ خطِ شفیعہ اور نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ ورزش بھی کیا کرتے تھے اور فنِ شہسواری و سپاہگری و تیراندازی میں ماہر و مشاق تھے۔

ابتداءً میر تخلص کرتے تھے لیکن میر تقی میر کی عالمگیر شہرت کے مقابلے میں میر کو بے فروغ پا کر سوز تخلص اختیار کیا۔

میر سوز کی زبان غزل کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ یعنی صاف سادہ اور شیریں۔ کلام تصنّع اور تکلّف سے قطعی پاک ہے۔ روزمرّہ اور محاورہ کو نہایت خوبی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں۔ فارسی اضافت۔ تشبیہ و استعارہ و تراکیب بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خیالات سیدھے سادے بلکہ روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ معشوق کو فقط جان یا میاں یا میاں جان کہہ کر خطاب کرنا اُن کا خاص محاورہ ہے۔ مضمون جیسے سیدھے سادے ہوتے ہیں ویسے ہی آسان آسان طرحیں بھی لی ہیں۔ ردیف چھوڑ کر اکثر قافیہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پڑھنے کا طریقہ بھی وہ ایجاد کیا تھا کہ پڑھتے وقت خود مضمون کی تصویر بن جاتے تھے۔ آواز میں درد تھا۔ اور پھر اس اداکاری سے شعر عجب مزا دیتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

بھلہ رے عشق تیری شوکت و شان　　بھائی میرے تو اُڑ گئے اوسان
ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے　　دوسرے غم نے کھائی میری جان
بس غمِ یار ایک دن دو دن　　اس سے زیادہ نہ ہوجیو مہمان
نہ کہ بیٹھے ہو پاؤں پھیلا کر　　اپنے گھر جاؤ خانہ آبادان
عارضی حُسن پر نہ ہو مغرور　　میرے پیارے یہ گوے یہ میدان
پھر ہے نے زلف و خالِ زیرِ زلف　　چار دن تو بھی کھیل لے چوگان

اور تو اور کہہ کے دو باتیں
سوز کہلایا صاحبِ دیوان

اہل ایماں سوزؔ کہتے ہیں کہ کافر ہو گیا     آہ یارب رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا
سوزؔ کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو     واں تجھے کیا تھی کمی یاں تجھ کو کیا درکار تھا
اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر     سوزؔ کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

---

## اس عہد کے دیگر خوش فکر شاعر

**نواب انعام اللہ خاں** | انعام اللہ خاں نام اور یقینؔ تخلص۔ دہلی کے رہنے والے تھے اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ پچیس سال کی عمر میں ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۵ء) میں اپنے والد کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ صاحبِ دیوان تھے۔ حال ہی میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے آپ کا دیوان حیدر آباد سے شائع کیا ہے۔

یقینؔ کی زبان نہایت صاف اور شُستہ ہے۔ دیوان میں کل ایک سو سترہ غزلیں ہیں اور سب پانچ پانچ شعر کی ہیں۔ اور کلام کا وہی رنگ ہے جو اُن کے اُستاد مرزا مظہر کا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

ہر گھڑی صحرا نشینی پر نہ کر جرأت یقینؔ     آگئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا
تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ     یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا
کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق     اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
عشق میں ملتی نہیں راحت اگرچہ کوہکن     جانِ شیریں دیجیے تب خواب شیریں کیجیے

---

**میر محمد بیدار** | میر محمد علی نام۔ بیدار تخلص تھا مگر شہرت میر محمدی کے نام سے ہوئی۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہیں نشو و نما بھی ہوا۔ حضرت خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ طریقہ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی ورزش کرنے کے بعد خرقہ خلافت پہنا۔ آخر عمر میں آگرہ جا بسے تھے وہاں ۱۱۹۴ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ جب میر و مرزا نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدار نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بقدر مناسب شامل کر کے اپنے طرز کلام کو علیحدہ کر لیا۔

نمونہ کلام یہ ہے :۔

اک میں ہی غمزدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا | کس کس کا دل نہ شاد کیا تو نے اے فلک
صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا | بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی
اے نالہ جانسوز یہ کیا بے اثری ہے | اب تک مرے احوال سے واں بے خبری ہے
محو خیال یار رہے ہم جہاں رہے | نے میکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا

# تبصرہ

**زبان** | یہ زریں دور زبان کی ترقی کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے۔ میر۔ درد اور سوز نے زبان کی صفائی کی ایسی کامیاب کوشش کی کہ نظم اردو ان حضرات کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ سودا نے فارسی کی لطیف اور نفیس تراکیب سے اردو میں وسعت پیدا کی۔ ایرانی محاوروں کو کہیں ترجمہ کر کے، کہیں تصرف کی مدد سے اردو

میں اس طرح کھپایا کہ جزو زبان بن گئے اُن ہندی الفاظ سے جو بار نما اور ثقیل تھے دامن اُردو کو پاک کیا۔ اِسی دور میں زبان کی ترقی کے لئے مشاعرے منعقد ہوئے۔ چنانچہ اوپر گزر چکا ہے کہ پہلے دردؔ کے یہاں اور پھر میرؔ کے یہاں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اِن مشاعروں میں خاص طور پر زبان کی جانچ پڑتال اور دیکھ بھال ہوا کرتی تھی۔

**موضوعِ سخن** اس دَور کو اگر صوفیانہ دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اکثر و بیشتر شعراء علمی یا اعتقادی طور پر صوفی اور بزرگ تھے۔ حضرت مظہرؔ، میرؔ صاحب، بیدارؔ، یہاں تک کہ سوداؔ کے کلام میں بھی تصوف اور اخلاق کی چاشنی بڑا مزہ دیتی ہے۔ اِن کے علاوہ خواجہ دردؔ نے تو اپنے کلام کی بنیاد ہی تصوف اور اخلاق پر رکھی۔ اور سادگی بیان کے ساتھ وہ وہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین نظم کئے کہ باید وشاید۔

**اصنافِ سخن** اس دَور میں غزل معراجِ کمال پر پہنچی۔ اور گوناگوں اسلوب بیان غزل میں اضافہ ہوئے۔ سوز وگداز جو غزل کی جان ہے اِس دور کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہر آیندہ آنیوالے دَور نے اِس دَور کی غزل کے روبرو سرِ تسلیم خم کیا ہے اور حقیقت ہے کہ صفائی۔ سادگی۔ جوش و صداقت بیان۔ رنگینی جذبات۔ سوز و گداز اور اثر جس قدر اِس دَور نے غزلیات میں بھرا آج تک نصیب نہ ہوا۔ اور نہ آیندہ اُمید۔ کیونکہ نہ وہ سادگی رہی نہ صفائی۔ وہ عشق رہا نہ وہ رنگینیٔ حسن۔ اور اگر ہو بھی تو وہ شیرینیٔ زبان کہاں۔

قصیدے کے لئے بھی اس دور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سوداؔ نے اس زمین کو اس قدر بلند کیا کہ فارسی قصیدہ کے ہم رُتبہ کر دیا۔ آیندہ ادوار میں بجز چند شعراء کے کوئی سوداؔ کو نہ پہنچ سکا۔

مثنوی بھی اس دور میں خوب پھلی۔ میرؔ نے بھی لکھی اور سوداؔ نے بھی۔ مگر میر حسنؔ نے کمال کر دیا اور سحر البیان میں وہ سحر بیانی کی کہ آج تک اُس کا جواب تو ایک طرف اس کا عشر عشیر بھی کسی مثنوی نے پیش نہ کیا۔

واسوخت اسی عہد میں ایجاد ہوا اور میرؔ اُس کے موجد ٹھہرے۔ ہجو نے بھی اِس دور میں فروغ پایا۔ کاش اِس دور کے دامن میں یہ خار نہ ہوتے۔

## اسلوب بیان

موضوع سخن اور غزل کے عنوانات سے جو خصوصیات اس دور کی بیان ہوئیں وہی اسلوب بیان کی خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم خصوصیت اس دور کی یہ ہے کہ اُردو شاعری کی جبیں سے ایہام کا داغ مٹ گیا۔ حضرت مظہرؔ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اِس تکلف کو ترک کر کے شعراء کے لئے راستہ صاف کیا اور ایک زبردست رُکاوٹ کو ہٹا دیا۔ سوداؔ نے تشبیہ و استعارہ برتا لیکن ایسا جیسے آٹے میں نمک۔ زیادہ تر اشعار ایسے لکھے گئے کہ خواہ اُنھیں حقیقت کی طرف لیجاؤ خواہ مجاز کی طرف۔ مدعا یہ کہ غزلیات میں جذبات نگاری ہے۔ خارجی اور صنفی حُسن کی عریاں تعریف و توصیف نہیں۔ اور اس کی وجہ ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ انشاء اللہ آیندہ موقع و محل پر بیان ہوگی۔

**مرثیہ** اِس دَور میں مرثیہ بھی لکھا گیا لیکن مرثیہ کے لئے ایک علیحدہ باب کا انتظار کیجیے۔

# باب ۵

## اُردو شعر و شاعری کا تیسرا دور

**شیخ قلندر بخش جرأت** قلندر بخش نام۔ جرأت تخلص۔ حافظ امان کے بیٹے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن نشو و نما فیض آباد میں ہوا۔ اِن کے بزرگ دربارِ شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے۔ لیکن جرأت نے ترقی کر کے اقلیمِ سخن کی بادشاہت حاصل کی۔ جوانی میں بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن عشقِ سخن جاری رہا۔ فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ آخر سنہ ۱۸۱۰ء میں وہیں پیوند خاک ہوئے۔

جرأت جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے۔ موسیقی اور ستار بجانے میں بھی کامل تھے۔ اپنے زمانے میں بذلہ سنج اور لطیفہ گو مشہور تھے۔ انشا اور اُن کی صحبتیں خوب گرم رہتی تھیں۔

جرأت کا دیوان چھپ چکا ہے۔ اُس میں غزلیں، رباعیاں، مخمّس، مستزاد، واسوخت، ہجویں وغیرہ اصناف شامل ہیں۔ جرأت اپنے رنگ کے

باکمال شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری کی سطح بلند نہیں۔ باتیں ہی باتیں ہیں۔ نہ کلام میں عمق ہے۔ نہ خیالات میں بلند پروازی۔ عشق و محبت کی سیدھی سادی واردات ہیں لیکن عشق بھی بلند قسم کا نہیں۔ اگر بجائے عشق کے ہوس کہا جائے تو بجا ہے۔ لیکن زبان نہایت صاف اور سادہ پائی ہے۔ محاورہ کا لطف بھی ہر جگہ موجود ہے۔ اِن کے ہاں مسلسل غزلیں بھی پائی جاتی ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رُک کے وہ کہے ہے جو ٹک اُس سے لگ چلوں
بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں
پہلو میں کیا کہوں جگر و دل کا کیا ہے رنگ
کس روز اشک خونیں سے تر آستیں نہیں
فرصت جو پا کے کہیئے کبھو دردِ دل سو ہائے
وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں
آتش سی پھُک رہی ہے مرے تن بدن میں آہ
جب سے کہ روبرو وہ رُخِ آتشیں نہیں
اُس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ دل
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں
سنتا ہے کون کس سے کہوں درد بیکسی
ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہمنشیں نہیں
ہر چند ہے یہ لطف شبِ ماہ سیرِ باغ
اندھیر پر یہی ہے کہ وہ مہ جبیں نہیں
آنکھوں کی راہ ہے نکلے کیا حسرتوں سے جی
وہ روبرو جو اپنے دمِ واپسیں نہیں
طوفانِ گریہ کیا کہیں کس وقت ہم نشیں
موجِ سرشک تا فلکِ ہفتمیں نہیں
حیرت ہے مجھ کو کیونکہ وہ جرأت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

## میر انشا اللہ خاں انشا

میر انشا اللہ خاں نام ۔ انشا تخلص میر ماشا اللہ خاں کے بیٹے تھے ۔ آپ کی ولادت کا فخر مرشد آباد کو حاصل ہے ۔ میر ماشا اللہ خاں حکیم اور شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھے ۔ چنانچہ میر انشا اللہ خاں کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھوں میں لی ۔ انشا خود بلا کے ذہین اور ذکی تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربی و فارسی میں استعداد کامل پیدا کی ۔ فن طبابت خاندانی طرۂ امتیاز تھا اُسے بھی حاصل کیا ۔ اور آخر میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے ۔ عربی ، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ۔ اُردو میں خصوصاً

وہ کمال پیدا کیا کہ آسمان شاعری پر مہر و ماہ ہو کر چمکے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت مغلیہ بساط تھی اور بادشاہ شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ انشا اسی عہد میں دہلی آئے۔ شاہ عالم ثانی نے قدر دانی کی۔ یہ دربار میں داخل ہوئے۔ اور چند روز اپنی زور طبیعت اور شگفتہ مزاجی کا ڈنکا بجایا۔ لیکن جب خزانہ کو خالی پایا تو دربار سے جی اچاٹ ہوا۔ دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ سلیمان شکوہ شاہ عالم ثانی کے بیٹے تھے۔ انھوں نے باپ کا نمکخوار سمجھ کر اور کچھ اُن کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے اُن کی سرپرستی کی اور اپنی غزلیں اصلاح کے لئے انھیں دینے لگے۔ لیکن اُن کی فطرتِ سیماب پا نے قناعت سے نہ بیٹھنے دیا۔ اور نواب سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچایا۔ اب انشا کا ستارۂ اقبال چمکا اور نواب کے مزاج میں وہ دخل پایا کہ نواب کو اُن کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ خصوصاً بذلہ سنجی۔ لطیفہ گوئی اور شوخی طبع اگر حد سے تجاوز کر جائے تو باعث ملال ہو جاتی ہے۔ نواب صاحب فطرۃً متین اور سنجیدہ مزاج تھے۔ انشا کے مزاج میں تمسخر تھا۔ اس وجہ سے نواب کے ساتھ زیادہ دنوں تک نہ بن سکی۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں اقبال نے منھ موڑا اور یہ دربار کا چہچہاتا ہوا بلبل اپنے مکان کے قفس میں بند کر دیا گیا۔

آزاد نے آبِ حیات میں انشا کے مجنوں ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بڑی دردانگیز تصویر کھینچی ہے۔ اگرچہ بے ثباتی دنیا اور حادثاتِ زمانہ

سے کچھ بعید نہیں۔ لیکن اس تصویر کی تیاری میں حضرت آزاد کی جادو طرازی نے خاص طور سے رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ "حیاتِ دبیر" کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو انشا کے نواسے تھے کہ انشا نہ مجنوں ہوئے نہ اُن کی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اِتنا صحیح ہے کہ نواب صاحب نے حکم دیدیا تھا کہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی اِسی وقت حاضر ہوں جب بُلایا جائے۔ چنانچہ انشا نے اِسی حبس بیجا کی طرف اشارہ کیا ہے :—

بدوں حکم وزیر الممالک اے آغا    چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازی

آخر اِسی حالت میں ۱۸۱۷ء میں قیدِ حاکم کے ساتھ قیدِ حیات سے آزاد ہوئے۔

انشا کے علم و فضل، ذہن و ذکاوت، مشقِ سخن اور زورِ کلام میں کسی شک و گمان کو دخل نہیں۔ کلیات چھپ چکا ہے۔ اُس میں کیا کیا کچھ نہیں ہے۔ دیوان فارسی کے علاوہ قصیدے، غزلیں، خطوطِ منظوم، رباعیاں، پہیلیاں، چیستانیں، ہجویں اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ اُردو فارسی کے علاوہ پنجابی، پوربی، بھاشا، مرہٹی، کشمیری وغیرہ زبانوں کو بے ساختہ استعمال کرکے اپنی طبیعت کی ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے لیکن افسوس کہ اُن کی شاعری کو تمسخر نے ڈبویا۔ اُن کی شوخ اور چنچل طبیعت اُنھیں کسی جگہ جم کر بیٹھنے نہیں دیتی۔ ابھی ممنت بنے بیٹھے ہیں۔ ابھی آزادوں کے انداز میں مستزاد کہہ رہے ہیں۔ کہیں ہجو کے کانٹوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ کہیں لطافت و ظرافت کے زور میں طبیعت کو بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ مدعا یہ کہ

انشا سا قادر الکلام اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا تو زبان اُردو کے لئے خصوصاً اور ملک کے لئے عموماً بڑا مفید ثابت ہوتا۔

کلّیات کے علاوہ انشا نے ایک کتاب "دریائے لطافت" بھی لکھی جو ۱۸۰۲ء میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ اُردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ فارسی میں لکھی گئی ہے لیکن جا بجا اُردو اشعار اور نثر کے ٹکڑے اس میں درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ "رانی کیتکی" کی کہانی خالص اُردو میں لکھی ہے یعنی عربی اور فارسی الفاظ کو اس میں دخل نہیں۔ تاہم فصاحت، روزمرّہ اور محاورہ سے گری ہوئی نہیں ہے۔ قصیدوں میں انگریزی الفاظ کو نہایت بے ساختگی سے استعمال کیا ہے۔ جن میں سے اکثر الفاظ آج ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمّل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر اِن سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

لگاکے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا　　جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اُٹھ کہیں گھر چل　　خدا کے واسطے اِتنے تو پاؤں مت پھیلا
نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں　　کہ روز دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ　　درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا
نزاکت اُس گلِ رعنا کی دیکھیو انشا
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

**شیخ غلام ہمدانی مصحفی**

غلام ہمدانی نام، مصحفی تخلص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے ۱۷۵۰ء میں بمقام امروہہ پیدا ہوئے اور عنفوانِ شباب میں دہلی آئے۔ طبیعت میں موزونیت خداداد تھی۔ علوم متداولہ سے فارغ ہو کر شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ بزرگانِ دہلی کی صحبتوں نے مذاقِ شاعری درست اور کثرتِ مشق نے بزمِ شعرا میں چرچا کیا۔ جب تک دہلی

میں رہے اپنے گھر پر مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ مزاج میں غربت، مسکینی اور ادب کی پابندی تھی۔ اس وجہ سے سب شعرا اور معزز اشخاص لطف و مروّت سے پیش آتے تھے۔ انھیں بھی دہلی اور اہلِ دہلی سے اس قدر محبت تھی کہ دہلی ہی کو اپنا وطن بنایا۔ اور مرتے دم تک اس کی محبت دل میں رہی۔

جب دہلی تباہ ہوئی اور اہل کمال کا مجمع منتشر ہوا۔ مصحفی نے بھی بادلِ ناخواستہ دہلی کو خیرباد کہا۔ چند روز ٹانڈہ میں نہایت فارغ البالی کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ لیکن قسمت نے کچھ یاوری نہ کی۔ ناچار دہلی واپس آئے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد کشش آب و دانہ پھر انھیں لکھنؤ لے گئی۔ اس مرتبہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے انھیں اپنا اُستاد بنایا۔ رفتہ رفتہ مصحفی جگت اُستاد ہوگئے۔

دورانِ قیام لکھنؤ میں مصحفی اور انشا کے خوب معرکے ہوئے۔ یہ معرکے شاعرانہ تعریضوں سے شروع ہو کر ہجوؤں تک نوبت پہنچی اور آخر میں تو یہ حال ہوگیا کہ ابتذال اور رکاکت پر تہذیب اور شائستگی نے آنکھیں بند کرلیں۔

مصحفی کو مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے صرف پچیس روپئے ماہوار ملتے تھے۔ جب میر انشا اللہ خاں کو باریابی ہوئی اور وہ شاہزادہ کی غزلیں بنانے لگے تو ان پچیس روپیوں میں بھی تخفیف ہوگئی۔ خود فرماتے ہیں ع

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے

غرض اس افلاس میں گذر اوقات کے لئے غزلیں اور اشعار بیچتے تھے۔ اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے ایام بسر کرتے تھے۔ آخر اسی حالت میں ۱۸۲۴ء میں داعیِ اجل کو

لبیک کہا۔

مصحفی نے آٹھ دیوان اپنی یادگار چھوڑے جو آپ کی اُستادی اور قادر الکلامی کو مسلّم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ تذکرہ شعرائے اُردو بزبانِ فارسی لکھا۔ اس میں محمد شاہی عہد سے مصحفی کے معاصرین تک کل شعرا کا حال درج ہے۔

"آبِ حیات" میں مولانا آزاد نے جا بجا سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دی ہے۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب ہمارے روبرو کلّیاتِ انشا اور دواوینِ مصحفی موجود ہیں۔ انشا کی ذہانت، طبّاعی، بذلہ سنجی اور ظرافت میں جائے کلام نہیں۔ علم و فضل بھی مسلّم ہے۔ لیکن سخن سنجی، مشّاقی اور متانت میں مصحفی سید صاحب سے بہت آگے ہیں۔ اگر مصحفی کے آٹھ دیوانوں میں سے بلند مرتبہ اور معیاری اشعار انتخاب کئے جائیں تو سید صاحب کے مجموعۂ ہزل و غزل کے برابر ایک مجموعہ اُن کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں مصحفی کی اُستادی، مشاقی اور ہردل عزیزی کا ایک زندہ ثبوت یہ بھی ہے کہ خواجہ حیدر علی آتش، میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اسیر جو اپنے وقت میں مسلم الثبوت اُستاد ہوئے انھیں کے دامنِ تربیت میں پل کر جوان ہوئے تھے۔

مصحفی کا کلام اس امر کا مُقتضی ہے کہ انھیں اُردو شعر و شاعری کے عہدِ زرّیں یعنی دورِ دوم میں جگہ دی جائے۔ کیونکہ جہاں ان کے کلام میں میر کا سا درد، سودا کا سا زور اور میر سوز کی سی سادگی پائی جاتی ہے۔ وہاں خیالات میں متانت اور طرزِ ادا میں استواری بھی ہے۔ زبان پر بھی بہت سے

قدیم الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ قصیدوں میں جوش و خروش نہ سہی لیکن انداز وہی سوداؔ کے قصیدوں کا ہے۔ لیکن چونکہ عہد زرّیں کے شعراء اور مصحفیؔ میں بیس بیس تیس تیس برس کا تفاوت ہے۔ اور اِن کی اور سیّد انشاؔ کے درمیان خوب نوک جھونک رہی ہے۔ اس لئے مجبوراً انھیں دَورِ سوم میں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دَور کا صدر اگر کسی کو بنایا جا سکتا ہے تو وہ آپ ہی ہیں۔

سطورِ بالا سے مصحفیؔ کے کلام کے متعلق کچھ اندازہ ہوا۔ اِن کا کوئی خاص ذاتی رنگ نہیں ہے۔ بزرگوں ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور اسی میں سعادت سمجھتے ہیں۔ البتہ سیّد انشاؔ کے خلاف اصولِ فن کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ غزلوں میں اکثر سنگلاخ زمینیں اختیار کی ہیں۔ اور اپنی قادر الکلامی کی مدد سے انھیں ہرا بھرا کیا ہے۔

نواب کلب علی خاں مرحوم نے اُن کے آٹھوں دیوانوں کا خلاصہ کرا کر چھپوا دیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

دن جوانی کے گئے موسمِ پیری آیا — آبرو خواب ہے اب وقتِ حقیری آیا

تاب و طاقت رہے کیا خاک کہ اعضا کے تئیں — حاکمِ ضعف سے فرمانِ تغیری آیا

سبق نالہ تو بلبل نے پڑھا مجھ سے ولے — نہ اُسے قاعدۂ تازہ صفیری آیا

شاعری پر کبھی اپنی، جو گئی اپنی نظر — نہ ضمیر اپنے میں اُس وقت ضمیری آیا

پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ واں — قیس مارا گیا وامق بااسیری آیا

چشم کم سے نہ نظر مصحفیؔ خستہ پہ کر

وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہووے گا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یاں — رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط — یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

## شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی

نظیر کے جیتے جی اور اُن کے بعد عرصہ دراز تک لوگوں کی توجہ اس بے نظیر شاعر کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ مگر اب زمانہ آگیا ہے کہ تاریخ ادب اُردو میں اس معلّم اخلاق شاعر کو نمایاں جگہ دی جائے۔ لیکن یہ ایک اہم سوال ہے کہ کون سے دَور میں انھیں جگہ دی جائے۔ نظیر ۱۷۴۰ء میں پیدا اور ۱۸۳۰ء میں فوت ہوئے۔ اس اعتبار سے آپ کی عمر دو دَوروں میں یعنی دَورِ دوم و سوم میں گزری۔ آپ نے میر و سودا کا عہد بھی پایا اور مصحفی و انشا کا بھی۔ اب رہا کلام۔ وہ نہ دَورِ دوم کا ہے نہ دَورِ سوم کا۔ بلکہ اگر زبان سے قطع نظر کر لی جائے تو دَورِ حاضرہ کے شاعر کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اُردو" میں نظیر کے لئے ایک الگ باب قائم کیا ہے۔ اور اس میں نصیر دہلوی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ مسٹر ٹی۔ گریہم بیلی نے انھیں مصحفی و انشا کے دَور میں جگہ دی ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ چھوڑ جاؤں یہ ناممکن ہے۔ الگ دَور قائم کروں تو اس کے لئے نظیر کے ہمزبان شعراء کی جماعت کہاں سے لاؤں۔ ناچار مسٹر ٹی۔ گریہم بیلی کے نقشِ قدم پر چلتا ہوں۔

شیخ ولی محمد نام۔ نظیر تخلص خلف محمد فاروق، دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس لئے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ لڑکپن میں اپنی والدہ کے ہمراہ آگرہ پہنچے اور محلہ تاج گنج میں سکونت اختیار کی۔ علوم متداولہ حاصل کئے۔ چنانچہ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

نظیر آزادمنش، درویش مزاج اور قناعت گزیں آدمی تھے۔ نواب سعادت علیخاں نے لکھنؤ بلایا۔ مہاراجا بھرت پور نے بھی طلب کیا مگر آپ نے گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر درباداری کے دردسر کو قبول نہ کیا۔ آگرہ ہی میں ایک معلم کی حیثیت سے بسر اوقات کرتے رہے۔ آخر اسی حال میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا۔

نظیر کا کلیات چھپ چکا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے بہت سے عنوانات پر نظمیں ہیں۔ زیادہ تر مسدس اور مخمس ہیں۔ اکثر و بیشتر نظمیں ظرافت آمیز ہیں۔ حقائق و معارف کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔ واقعات زمانہ کو اچھے اور برے دونوں پہلوؤں سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ کلیات گوناگوں خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ ہے۔ کہیں رندی کا رنگ جھلکتا ہے کہیں زہد و پارسائی کا، کہیں پند و نصائح ہیں اور کہیں حقائق و معارف۔ بعض نظمیں موت، فنا، ترک دنیا وغیرہ پر نہایت مؤثر طریقہ پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن افسوس کہ نظیر کے کلام میں ہمواری نہیں۔ جو جو نظمیں متانت اور قواعد کے زیور سے آراستہ ہیں وہ نہایت بلند پایہ ہیں اور نظیر کی قادرالکلامی پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اکثر نظمیں فحش گوئی۔ ابتذال۔ رکاکت کے علاوہ



نظیر اکبر آبادی

بے اصولی اور خلاف قواعد تصرفات کی وجہ سے پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ اوزان اور قوافی کی غلطیاں اور غلط الفاظ کا استعمال بکثرت ملتا ہے اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ عوام کی زبان زیادہ استعمال کرتے تھے۔ بہرکیف اگر کلیات نظیر کا انتخاب کیا جائے اور مبتذل مضامین کو خارج کر دیا جائے تو نہایت نفیس اور کارآمد گلدستہ تیار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مکتبہ ابراہیمیہ نے "جواہر کلیات نظیر" شائع کی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس مختصر تاریخ میں نظیر کے کلام کا نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ لہذا "جواہر کلیات نظیر" ملاحظہ فرمائیے۔

## تبصرہ

**زبان** اصلاح زبان کے لحاظ سے یہ دور کچھ زیادہ اہم نہیں۔ یوں تو عام طور پر زبان کی اصلاح ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہے۔ لیکن اس دور میں کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ نظیر کے کلام سے قطع نظر انشا۔ مصحفی وغیرہ شعراء کے ہاں کثرت سے قدیم الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً منت۔ ٹک۔ بھلا رے۔ زور۔ واچھڑے۔ جھگڑا وغیرہ۔

انشا نے ہندی الفاظ استعمال کئے۔ مگر سنجیدگی سے نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر کرخت اور غیر فصیح ہیں۔ مثلاً ڈنڈ۔ گنڈ منڈ۔ بھسنڈ۔ رنڈ وغیرہ۔

زبان کے سلسلے میں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادائے مطالب کی وسعت بڑھی ہوئی ہے۔ مصحفی کی قادر الکلامی نے ہر قسم کے مطالب کو نہایت صفائی سے ادا کر دیا ہے۔ جرأت کے ہاں بھی صفائی اور سادگی بہت پائی جاتی ہے۔

## اسلوب بیان

اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی یہ دور زیادہ اہم نہیں ہے۔ سید انشا اور نظیر اکبرآبادی کے کلام میں ظرافت اور تمسخر کی چاشنی ہے۔ نظیر کی ظرافت اکثر مقامات پر مفید ہے۔ لیکن انشا کا تمسخر حد سے بڑھ کر رکاکت تک پہنچ جاتا ہے۔ مصحفی کے کلام میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ لیکن اسلوب بیان وہی ہے جو متقدمین شعراء کا۔ نظیر اکبرآبادی نے البتہ گوناگوں اسلوب پیش کئے ہیں۔ جو اس دور کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر آیندہ دور کے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں تنگنائے غزل سے نکل کر انھوں نے ہر قسم کے ملکی، سماجی، اخلاقی مضامین پر طبع آزمائی کی۔ اُن کے کلام کی قدر اگرچہ اس عہد میں نہیں ہوئی مگر موجودہ عہد میں بہت سے شعراء اُن کے ہمزبان ہو گئے ہیں۔

## موضوع سخن

نظیر کو چھوڑ کر باقی تمام شعراء کے ہاں اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی نمایاں کمی معلوم ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ غزل میں ہر قسم کے وہ مضامین آتے جاتے ہیں جن کو غزل سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ غزل کے لئے قطعی ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ موضوع سخن عشق و عاشقی ہے۔ لیکن لطیف جذبات اور احساسات کی کمی ہے۔ عام طور پر کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے۔ کسی رنگ کو اس عہد کا خاص رنگ نہیں کہہ سکتے۔

## مقامی خصوصیات

اس دور کے شعراء نے خصوصاً نظیر نے ملکی اور مقامی خصوصیات کو زیادہ برتا ہے۔ مقامی میلوں ٹھیلوں، موسموں اور رسم و رواج وغیرہ کے متعلق کافی نظمیں لکھی ہیں۔

**ریختی** اگرچہ اُردو کے ابتدائی دَور میں مولانا ہاشمی بیجاپوری اور خاکی وغیرہ شعراء کے یہاں ریختی کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ریختی نتیجہ تھی ہندی اثر کا۔ ہندی شاعری کا یہ خاص رنگ ہے کہ اس میں اظہارِ عشق جنس لطیف کی طرف سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر عورتوں کے جذبات اور احساسات نظم کیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی دَور کی ریختی میں ہوا و ہوس، دل لگی اور ٹھٹھول کا پتا نہیں۔ پیشِ نظر دَور میں سعادت یار خاں رنگین اور اُن کے دوست

---

ا۔ ریختی اُس نظم کا نام رکھا گیا جس میں زنانی زبان میں زنانے جذبات و احساسات نظم کیئے جاتے تھے۔ واضح ہو کہ اُردو میں مردانی اور زنانی زبان میں ہمیشہ سے فرق چلا آتا ہے۔ خاص خاص الفاظ، محاورات عورتوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اسی طرح فارسی عطف و اضافت مردوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ریختی میں جہاں عورتوں کے مخصوص الفاظ، محاورات وغیرہ نظم ہوتے ہیں وہاں فارسی عطف و اضافت اور فارسی و عربی کے عالمانہ الفاظ سے قطعی گریز کیا جاتا ہے۔

ریختی کے امام جانؔ صاحب ہوئے۔ آپ کا نام میر یار علی خاں اور تخلّص جانؔ صاحب تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ رام پور میں ۱۲۸۴ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ ایک دیوان ریختی آپ کی یادگار ہے۔ اگر اس دیوان کو طرح طرح کے خطرناک کانٹوں سے پاک کر کے ایک مختصر انتخاب مرتّب کر لیا جائے تو بیگمات کی زبان، اُن کے خیالات، جذبات، احساسات، طریقۂ بود و باش، رسم و رواج وغیرہ کا اچھا خاصا دلچسپ مرقّع تیار ہو سکتا ہے۔

موجودہ عہد بھی ریختی گو شعراء سے خالی نہیں۔ چنانچہ شیداؔ صاحب الہ آبادی اب بھی مشاعروں کو اپنی ریختی سے شگفتہ کر دیتے ہیں۔ اُن کا ایک مجموعہ "آرسی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ریختیاں اور قصیدیاں وغیرہ شامل ہیں۔

سید انشا نے بقول غفر غینی "ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی . . . . . "
(آب حیات صفحہ ۱۱۰)

# باب ۶

# اُردو شعر و شاعری کا چوتھا دور (لکھنؤ میں)

**تمہید** اب تک جسقدر اساتذہ اُردو شاعری ہیں گزرے وہ سب دہلی کے رہنے والے تھے ۔ اگرچہ مصحفی امروہے کے رہنے والے تھے مگر اُنھیں بھی دہلی سے وہ محبت تھی کہ وہیں کی وطنیت پر فخر کیا کرتے تھے ۔ شہر دہلی زبان و ادب کا مرکز تھا ۔ بیرونجات کے شعرا زبان و ادب کے معاملات میں اساتذۂ دہلی کی تقلید کرتے تھے ۔ اہل لکھنؤ میں ابتک، کوئی صاحب کمال پیدا نہیں ہوا تھا ۔ شعرائے لکھنؤ بھی چنانچہ اساتذہ دہلی کو اپنا اُستاد مانتے تھے اور اُن کی تقلید کا دم بھرتے تھے ۔ لیکن اب اساتذۂ دہلی ایک ایک کرکے پیوند خاک ہونے شروع ہوئے ۔ میر ۔ سودا ۔ انشا ۔ مصحفی ۔ جرأت غرض سب میدان زندگی کے ساتھ معرکۂ شعر و ادب سے کنارہ کش ہوئے ۔ میدان صاف تھا ۔ اہل لکھنؤ نے صاحب کمال پیدا کرنے شروع کئے ۔ چنانچہ دہلی کی طرح لکھنؤ بھی مرکز سمجھا جانے لگا ۔ اہل لکھنؤ نے صاحب زبانی کا دعویٰ کیا اور دہلی کی تقلید کا جُوا کندھے سے اُتار پھینکا اور حقیقت یہ ہے کہ زبان کی اصلاح میں بڑے سلیقے سے کام کیا ۔ لکھنؤ اسکول کے بانی مبانی

شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش ہیں۔

**شیخ امام بخش ناسخ**

امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ سنہ ولادت معلوم نہیں۔ بچپن فیض آباد میں بسر ہوا۔ جب لکھنؤ اودھ کا دار الحکومت قرار پایا۔ تو آپ بھی لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں علوم متداولہ حاصل کئے اور عربی و فارسی میں کمال پیدا کیا۔ میر تقی میر حیات تھے۔ غزل لے کر اُن کی خدمت میں پہنچے۔ میر نے اصلاح کے شرف سے پہلو تہی کی۔ آپ مایوس ہو کر واپس آئے۔ اور خود ہی لکھتے اور خود ہی اصلاح کرتے رہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میر کے انکار کے بعد مصحفی اور تنہا سے مشورہ سخن کیا۔

کہتے ہیں کہ جب ناسخ لکھنؤ پہنچے تو وہاں میر کاظم علی ایک رئیس تھے۔ انھوں نے اُن کو اپنا فرزند بنا لیا۔ وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیت نامہ کی رو سے اُن کو ملی۔ پھر کیا تھا۔ ٹکسال میں مکان لیا اور فارغ البالی سے بسر اوقات کرنے لگے۔

ناسخ کو پہلوان سخن کہا جاتا ہے۔ اِن کے کلام سے تو اِن کی پہلوانی ٹپکتی ہی ہے۔ جسم کے بھی پہلوان تھے۔ ورزش کا شوق تھا۔ خوراک ایسی ڈبل تھی کہ آجکل کے اہل لکھنؤ مبالغہ سمجھیں تو بعید نہیں۔ دن رات میں ایک وقت کھاتے تھے مگر پانچ سیر پختہ۔ نہایت قوی ہیکل تھے۔ بلند بالا۔ فراخ سینہ۔ اور اِس پر رنگ سیاہ۔

لکھنؤ میں قمر الدین احمد عرف مرزا حاجی، عالی خاندان، علوم و فنون میں صاحب استعداد اور مذاق سخن سے آشنا تھے۔ اِن کا گھر قبلۂ حاجات بنا ہوا تھا۔

اہلِ فضل و کمال اِن کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ شعر و سخن کا مشغلہ، زبان کی تراش خراش اور تحقیقات علمی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا۔ اِسی صحبت میں ناسخ کا نشو و نما ہوا۔ اور اصلاح زبان کا چسکا اِسی صحبت میں پڑا۔ ذاتی قابلیت اور مرزا حاجی کی مصاحبت نے اُن کی شخصیت کو بڑھایا۔ اہل فہم اور اہلِ کمال اِن کی طرف کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔

ناسخ نے متعدد سفر کئے۔ الہ آباد بھی گئے تھے۔ دیوان چندو لعل نے حیدر آباد بھی بلایا مگر نہیں گئے۔ لکھنؤ سے کمال محبت تھی۔ آخر اِدھر اُدھر کے سفر سے فارغ ہو کر لکھنؤ آئے اور وہیں ۱۸۳۸ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔

تین دیوان آپ کی یادگار ہیں جن میں سے دو بہت مشہور ہیں چھپ چکے ہیں اور ہر جگہ دستیاب ہوتے ہیں۔ دیوانوں میں سوائے غزلیات، رباعیات اور قطعات کے اور کچھ نہیں۔ قصیدہ کبھی نہیں لکھا۔ ہجو سے بھی قطعی گریز کیا ہے۔ آپ نے ایک مثنوی "نظم سراج" تصنیف کی جو مشہور نہیں ہوئی۔ ناسخ کی شہرت زیادہ تر اُن کی غزلیات کی وجہ سے ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی ناسخ کو خاص کمال حاصل تھا۔ چنانچہ سینکڑوں تاریخیں دیوانوں میں موجود ہیں۔

غزلیات میں ناسخ کا رنگ گزشتہ تمام شعرا سے مختلف ہے۔ سب سے پہلی خصوصیت اِن کے کلام کی یہ ہے کہ اغلاط اور عیوب سے قطعی پاک ہے۔ قواعد اور اصول کی بڑی سختی سے پابندی کی گئی ہے اور اِس پابندی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کلام پھیکا اور بے نمک ہو گیا ہے۔ جذبات اور احساس کا خون بہانا اِنھیں منظور ہے لیکن بے قاعدگی اور بے اصولی گوارا نہیں۔ اور یہ پھیکا پن

اِن کے کلام کی دوسری بڑی خصوصیت ہو سکتی ہے۔

کلام میں تشبیہات اور استعارات کی بہتات ہے۔ نازک خیالی، مضمون آرائی اور بلند پروازی کو دوراز کار تشبیہ اور استعارے کے پیچ میں اُلجھا کر بے اثر اور بے کیف کر دیتے ہیں۔ کلام میں مبالغہ، بے اثری کی حد سے گزر کر بعض اوقات درد سری تک پہنچ جاتا ہے۔ اخلاقی مضامین کو نیم منطقی دلیل، تمثیل، حُسن تعلیل اور بعض اوقات لفظی ہیر پھیر سے اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ اِن میں اثر مطلق نہیں رہتا۔ خارجی مضامین زیادہ پائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ باقاعدگی، تصنّع، مبالغہ، بے اثری اور اُلجھاؤ ناسخ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ علاوہ ازیں فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ سے کہیں کہیں کلام میں غرابت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیات شعر و شاعری کے مقصد کے منافی ہیں۔ لیکن اس امر کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے کہ ناسخ ارتقا و اصلاحِ زبان کی تاریخ میں سنہرے صفحات کے مستحق ہیں۔ اُردو زبان اِن کے احسانات سے تاقیامت سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

ناسخ نے زبان اُردو پر جو احسانات کئے اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کے لئے تذکیر و تانیث کے قاعدے مقرر کئے۔

(۲) ثقیل اور بدنما الفاظ و محاورات کو ترک کر کے لطیف و فصیح الفاظ اور محاورات رائج کئے۔ مثلاً "ٹک" کی بجائے "ذرا"۔ "نپٹ" کی بجائے "بہت"۔ "تجھ سوا" کے بجائے "تیرے سوا" وغیرہ

(۳) ثقیل اور بھونڈے ہندی الفاظ کو ترک کیا۔ فارسی اور عربی الفاظ

زیادہ استعمال کئے جس سے زبان میں وسعت پیدا ہو گئی۔

(۴) غلط افعال کو ترک کیا۔ مثلاً کاہلی سے کہلانا وغیرہ متروک قرار دئے۔

(۵) غزل میں عاشقانہ مضامین کے علاوہ اور اور مضامین شامل کئے اور آیندہ ترقیوں کے لئے میدان صاف کر دیا۔

(۶) فحش، مبتذل اور عامیانہ الفاظ ترک کر دئے۔ اور غزل میں متانت اور سنجیدگی کی بنیاد قائم کی۔

اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

دم بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا  جھونکا نسیم کا جو نہی سن سے نکل گیا
لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازہ پر  شعلہ سا ایک جیبِ کفن سے نکل گیا
ساقی بغیر شب جو پیا آبِ آتشیں  شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا
اب کی بہار میں یہ ہوا جوش اے جنوں  سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا
اس رشکِ گل کے جاتے ہی بس آگئی خزاں  ہر گل بھی ساتھ بو کے چمن سے نکل گیا
اہلِ زمیں نے کیا ستم نو کیا کوئی  نالہ جو آسمانِ کہن سے نکل گیا

سنسان مثل وادئ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

---

مرتبہ کم حرصِ رفعت سے ہمارا ہو گیا  آفتاب ایسا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا
ہے تصوّر نوکِ مژگاں کا جو ہر دم سامنے  دیدۂ گریاں ہمارا اب ہزارا ہو گیا
باعثِ چاکِ کتاں ہوتا ہے جلوہ ماہ کا  واں چھپا وہ ماہ یاں دل پارہ پارہ ہو گیا
ایک درہم اور داخل گنج قاروں میں ہوا  پست ایسا میرے طالع کا ستارا ہو گیا

بے ثباتی جو ہوئی عالم کی ثابت اے فلک آفتاب اپنی نظر میں اک شرارا ہو گیا
ختم ہے جادو گری تم پر کہ اے چشمانِ یار
ناسخ جادو بیاں عاشق تمہارا ہو گیا

**شاگردانِ ناسخ** یوں تو سینکڑوں موزوں طبع شیخ امام بخش ناسخ کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر شاعر ہوئے۔ اور آدھے سے زیادہ لکھنؤ آپ کا معتقد تھا۔ مگر چند شاگرد صاحبِ دیوان اور فخرِ استاد ہوئے۔

**خواجہ وزیر** خواجہ محمد وزیر نام۔ وزیر تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ پہلے خواجہ آتش سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ پھر ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ نازک خیال اور قادر الکلام شاعر تھے۔ شیخ صاحب بھی اُن کی شاگردی پر فخر کرتے تھے ۱۸۵۴ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

**میر علی اوسط رشک** پورا نام و لقب والا جاہ میر علی اوسط اور رشک تخلص ہے۔ لکھنؤ میں نشو و نما ہوا۔ ایک ضخیم دیوان آپ کی یادگار ہے۔ تاریخ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۶۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

**برق** مرزا محمد رضا خاں نام اور برق تخلص تھا۔ واجد علی شاہ اختر کے مصاحب اور اُستاد تھے۔ بہت پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جہان فانی سے کوچ کیا۔

**بحر** شیخ امداد علی نام اور بحر تخلص تھا۔ صحت الفاظ، تحقیق لغت اور فن عروض میں مشہور تھے۔ تمام عمر عسرت اور تنگ حالی میں بسر ہوئی۔

نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور نے شہرہ سن کر بلا بھیجا اور عزت افزائی فرماکر تنخواہ مقرر کردی۔ آخر وقت میں وطن یاد آیا۔ دربار سے رخصت ہو کر لکھنؤ واپس چلے آئے۔ آخر ۱۸۸۲ء میں رحلت فرمائی۔

**منیر شکوہ آبادی** سید اسمٰعیل حسین نام۔ منیر تخلص۔ شکوہ آباد کے رہنے والے تھے۔ پہلے نواب باندہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ غدر کے بعد نواب صاحب رامپور نے قدر افزائی فرمائی۔ آخر ۱۸۸۱ء میں انتقال ہوا۔ غزلیات میں وہی رنگ ہے جو ناسخ کا۔ مثنوی بھی لکھی لیکن مذہبی رنگ کی۔ البتہ قصائد ان کے بڑے دھوم دھام کے ہیں۔ سودا اور ذوق کے بعد انھیں کے قصیدوں پر نظر پڑتی ہے۔

**خواجہ حیدر علی آتش** خواجہ حیدر علی نام اور آتش تخلص تھا۔ آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش فیض آباد پہنچے۔ آتش وہیں پیدا ہوئے۔ ابھی جوان بھی نہ ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی خوب نہ ہوئی تھی کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی عمر زیادہ تر فوج کے لڑکوں میں گزری۔ جس کی وجہ سے آپ بانکے اور شورہ پشت ہو گئے۔

نواب محمد تقی کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے تو یہاں جرأت۔ انشا۔ مصحفی کا دور دورہ تھا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ اور کثرت مشق سے فخر اُستاد ہو گئے۔

علمی استعداد معمولی تھی لیکن بزرگوں کی صحبت اور مصحفی کی اُستادی نے

شاعری کی ضروریات سے واقف کر دیا تھا۔ اصنافِ سخن میں غزل کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ زبان کی تراش خراش، صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ اپنے وقت کے مسلّم الثبوت اُستاد ہو گئے۔

اسّی۸۰ روپئے مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا۔ شاگردوں یا امیروں میں سے کوئی سلوک کرتا تو اس سے انکار نہیں تھا۔ باپ دادا سے توکّل ترکہ میں پایا تھا اور ہوش سنبھالتے ہی بانکپن اور شورہ پشتی کی تعلیم ملی تھی۔ یہ دونوں انداز بڑھاپے تک قائم رہے۔

گیروا تہبند باندھتے تھے۔ ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا۔ بچے کام کا سلیم شاہی جوتا پانوں میں۔ ڈنڈے میں ایک چھلّہ سونے کا لگا رہتا۔ دوسرے تیسرے فاقے کی حالت میں چھلّہ رہن رکھ کر فاقہ شکنی کرتے۔ بھنگ پینے کا چسکا زندگی بھر رہا۔

لکھنؤ میں نواز گنج کے قریب ایک کچّا مکان خرید لیا تھا۔ اُسی میں رہتے تھے۔ شادی بھی کر لی تھی۔ ایک بیٹا تھا محمد علی جوشؔ۔ بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

اخیر زمانے میں معالی خاں کی سرائے میں اُٹھ آئے تھے۔ ڈاڑھی بڑھالی تھی۔ اُس پر مہندی کا خضاب کیا کرتے تھے۔ مگر وضعداری کی دوسری باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی رندانہ مزاج۔ وہی فقر و فاقہ۔ ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے۔ سامنے حقّہ رکھا رہتا تھا۔ کوئی امیر یا غریب آتا۔ اُس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقّہ پیش کیا جاتا۔ آخر اسی فقر و فاقہ میں ۱۸۴۷ء میں قفسِ عنصری سے آزاد ہوئے۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی۔

ایک دیوان مکمل اور ایک تتمہ اُن کی یادگار ہے۔ دیوان میں غزلیات کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ ناسخ کے ہمعصر ہیں اور کبھی کبھی اُن سے نوک جھوک بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن مصحفی اور انشاؔ کی طرح ہجو تک نوبت نہیں پہنچی۔

زبان اُردو کی اصلاح میں جو مرتبہ ناسخ کو حاصل ہے وہی خواجہ صاحب کو بھی حاصل ہے۔ ناسخ نے اصول مرتّب کئے۔ آتش نے صفائی اور محاورہ اور روزمرّہ کا بہترین صرف کیا۔ ناسخ کے خلاف آتش کے ہاں ثقیل الفاظ بہت کم ہیں۔ یعنی اُن کے کلام میں فصاحت زیادہ ہے۔

نازک خیالی اور بلند پروازی میں ناسخ بہت بلند ہیں۔ لیکن سوز و گداز، صفائی اور اثر کے لحاظ سے آتش کا کلام بہتر ہے۔ کہیں کہیں اخلاقی مضامین پُر تاثیر ہیں۔ اور تصوّف کی چاشنی بھی مزا دے جاتی ہے۔

اس دور کے عام رنگ یعنی تصنّع سے آتش کا کلام قطعی پاک نہ رہ سکا۔ خارجی اور سطحی مضامین بھی اِن کے ہاں بکثرت ملتے ہیں۔ کلام میں ناہمواری ہے۔ عامیانہ مضامین اور حُسن کے خارجی لوازمات کی تعریف سے کہیں کہیں کلام میں پستی آجاتی ہے۔ غلط الفاظ کا استعمال بھی کہیں کہیں نظر سے گزرتا ہے۔ مثلاً المضاف بجائے المضاعف۔ حلوہ بجائے حلوا۔ وغیرہ استعمال کئے ہیں۔ اس کو علمی استعداد کی کمی سمجھئے یا کچھ اور۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔۔۔۔

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی　　گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

بگولے کی طرح کس کس خوشی سے خاک اُڑاتا ہوں ——— تلاشِ کنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے
طلب دنیا کو کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی ——— خیالِ آبروئے ہمّتِ مردانہ آتا ہے
تماشا گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو ——— کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے
زیارت ہوگی کعبہ کی یہی تعبیر ہے اس کی ——— کئی شب سے ہمارے خواب میں بُت خانہ آتا ہے
عتاب و لطف جو فرماؤ ہر صورت سے راضی ہیں ——— شکایت سے نہیں واقف ہیں شکرانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے بُت خانہ ہمارا دل نہیں آتش
مقامِ آشنا ہے، یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

فریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بُت سے برہمن بگڑا
تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اُس کا چلن بگڑا
وہ بدخو طفل اشک اے چشم تر ہیں دیکھنا اک دن
گھروندے کی طرح سے گنبدِ چرخ کہن بگڑا
کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اُس کا دہن بگڑا
ارادہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو
وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتّوں کا بدن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

لگے منھ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
بناوٹ کیف مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منھ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

**شاگردانِ آتش** شاگردان آتش ہیں یوں تو میر دوست علی خلیل۔ صاحب مرزا شناور۔ میر وزیر علی صبا۔ نواب محمد علی خاں رند۔ نواب مرزا شوق بڑے بڑے نامور شعرا اور اُستاد گزرے ہیں۔ لیکن ہم یہاں صرف پنڈت دیاشنکر نسیم کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں :۔

**نسیم لکھنوی** پنڈت دیاشنکر کول نام۔ نسیم تخلص۔ لکھنؤ کے کشمیری برہمن تھے۔ سال ولادت ۱۸۱۱ء ہے۔ آپ کے والد کا نام منشی گنگا پرشاد کول تھا۔ عام دستور کے موافق اُردو فارسی کی تعلیم عالم صغرسنی میں پائی۔ شعرائے اُردو کا کلام برابر نظر سے گزرتا رہا۔ شعر و شاعری کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔

نسیم پستہ قامت، گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ سلسلۂ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی تھی۔ مگر افسوس کہ یہ چہچہاتا ہوا بلبل عین عالمِ شباب میں بعمر ۳۲ سال ۱۸۴۳ء میں دفعتہً خاموش ہوگیا۔

ایک مختصر دیوان غزلیات کا اور ایک مثنوی "گلزار نسیم" آپ کی یادگار ہے۔

غزلیات میں اُستاد آتش کا رنگ بہت کچھ نمایاں ہے۔ زبان کی صفائی اور فصاحت ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ اگرچہ کلام میں اس دور کی کل خصوصیات مثلاً تصنع، تناسب لفظی وغیرہ پائی جاتی ہیں لیکن نسیم کا کلام قطعی بے نمک نہیں۔

نسیم کی شہرت اُن کی غزلیات کی وجہ سے نہیں بلکہ "گلزارِ نسیم" کی وجہ سے ہے۔ اہلِ لکھنؤ خصوصاً اور اُردو داں ہندوستانی عموماً اس مثنوی پر جسقدر فخر کریں بجا ہے۔ شمالی ہند کی مایۂ ناز مثنوی "سحرالبیان" کے بعد جس مثنوی پر نظر پڑتی ہے وہ "گلزارِ نسیم" ہی ہے۔ اِس میں گل بکاؤلی کا قصّہ نظم ہوا ہے جو پہلے نثر میں تھا۔

"گلزارِ نسیم" کا خاص جوہر ایجاز و اختصار ہے۔ یہاں تک کہ اگر کہیں سے ایک شعر بھی حذف کر دیا جائے تو تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔ کلام میں پختگی ہے۔ معمولی سے معمولی بات بھی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کی نقش طرازیوں سے خالی نہیں۔ لیکن باوجود ان لایعنی تکلفات کے نسیم نے واقعہ نگاری، مصوری، جذبات نگاری، لطافت و متانت، روانی و برجستگی کا حق ادا کر دیا ہے۔

غزل کے دو شعر تبرکاً درج کئے جاتے ہیں۔ مثنوی کے لئے "گلزارِ نسیم" ملاحظہ ہو:-

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی     کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

جاں نکل جائے گی تن سے اے نسیم<br>
گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

# باب ۷

## اُردو شعر و شاعری کا چوتھا دور (لکھنؤ میں) ضمیمہ

### مرثیہ اور شعرائے مرثیہ گو

**مرثیہ** اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی موت پر اظہارِ غم کیا جائے اور مرحوم کے اوصاف اس طرح بیان کئے جائیں کہ سُننے والوں کے دل میں بھی غم و الم کا دریا موجزن ہو جائے۔ اِن معنوں میں اُردو میں کئی مرثیوں نے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کی ہے۔ مثلاً غالبؔ کا مرثیہ عارفؔ کی موت پر۔ حالیؔ کا مرثیہ غالبؔ کی موت پر اور مومنؔ کا مرثیہ اپنی محبوبہ کی موت پر۔

لیکن اُردو میں مرثیہ مع اپنی جملہ خصوصیات کے ایک خاص اصطلاحی معنوں میں سمجھا جانے لگا۔ یعنی اس نظم کو مرثیہ کہنے لگے۔ جس میں امام حسینؑ کی شہادت اور اُن کے اہل و عیال کے مصائب کا ذکر کر کے عزاداری کی جائے۔ اس باب کا موضوع یہی مرثیہ ہے۔

**ارتقائے مرثیہ** صنفِ مرثیہ نگاری اُردو شعر و شاعری کے ساتھ ہی عالمِ وجود میں آئی۔ باب دوم کے آخر میں مرثیہ کی ابتدا کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ یہاں اُس کا اعادہ کرنا چنداں ضروری نہیں۔ البتہ اِتنا ضرور ہے کہ نوریؔ، ہاشم علی برہان پوری اور قطبؔ شاہ کے بعد دکن میں ہر شاعر مرثیہ گوئی کو

ثواب اخروی اور نجات دارین کا ذریعہ سمجھتا تھا اور بطور توشۂ آخرت تھوڑا بہت ضرور کہہ لیا کرتا تھا۔

شمالی ہند میں ابتدائی شعراء کے ہاں مرثیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ فضلی نے ۱۷۳۳ء کے لگ بھگ "روضۃ الشہدا" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں اُن کی ایک مسلسل نظم درج ہے جس میں حضرت فاطمۃ الکبریٰ کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

یہ کیا بُرا پیرا تھا میرا ہائے اے لوگو! دولھا کو سوہائی نہیں اور موت سوہائی
لاشے کے کنے بیٹھ کہا اے مرے نوشہ تو مر گیا اور میرے تئیں موت نہ آئی
اے میرے بنے تیری بنی تیرے بنا ہائے کفنی گلے میں ڈال کرے گی یہ گدائی
اے میرے بنے ساس کو کیا منھ میں دکھاؤں دل میں کہے گی کیسی بہو بیاہ کے آئی

فضلی کے بعد میر تقی میر نے بھی مرثیہ لکھا مگر وہ اُن کی شان کے شایاں نہ تھا۔ اس وجہ سے اُن کے کلیات میں جگہ نہ پا سکا۔ بطور نمونہ دو ایک بند ملاحظہ ہوں :۔

دلوں پر محبّوں کی حالت عجب ہے مصیبت ہے، ماتم ہے، غم ہے، تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے
محبّوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے
کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہووے گا وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہووے گا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہووے گا قیامت میں یہ کچھ نہ ہو گا جواب ہے

اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا اُس کو بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء نے اِس صنف کو کبھی ادبی اہمیت نہیں دی۔ محض مذہبی فریضہ سمجھ کر جو کچھ ہو سکا لکھ لیا۔ اور مجالس عزا میں رو رُلا کر "ثواب اخروی حاصل کر لیا" غلط الفاظ، غلط محاورات، خلاف روزمرہ، عروض و قافیہ کی فروگذاشتیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ کسی سخن فہم کو مذہبی عظمت کے خیال سے اِن فروگذاشتوں پر اعتراض کرنے اور اِن مراثی کی تنقیص کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی لیکن دبی زبان میں اتنا ضرور کہہ دیا کرتے تھے کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" اور شعراء تو خیر ایک طرف۔ میر سے قادر الکلام نے بھی اس زمین کو کچھ بلند نہ کیا۔

سب سے اوّل سوداؔ نے اس صنف کی ادبی اہمیت دریافت کی اور اِن کے کارناموں کے بعد مرثیہ جو اب تک حصول ثواب کے لئے کہا جاتا تھا مقتضیات شاعری کے ہم عناں ہو کر ترقّی کے منازل طے کرنے لگا۔ چنانچہ وہ اپنے مراثی کے دیوان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

"لیکن مشکل ترین دقائق طریق مرثیہ کا معلوم کیا۔ کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا۔ چنانچہ اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا . . . . . . . پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔"

ابتدائی عہد سے لے کر میر تک مرثیہ نے صرف اس قدر ترقّی کی تھی کہ منفردہ سے مربع ہو گیا تھا۔ اور بس۔ بحریں مختلف ہوتی تھیں اور خصوصاً وہ شگفتہ بحریں زیادہ مستعمل تھیں جو بطریق سوز پڑھی جا سکتی ہیں۔

سوداؔ کی جدّت پسند طبیعت نے منفردہ اور مربع کے علاوہ دیگر شکلیں بھی استعمال کیں۔ اور اس طرح مراثی میں کسی حد تک تنوع پیدا کر دیا۔ اِن کے کلیّات میں مراثی کی مندرجہ ذیل شکلیں پائی جاتی ہیں۔

منفردہ ۔ مستزاد منفردہ ۔ مثلّث ۔ مستزاد مثلث ۔ مربع ۔ مستزاد مربع۔ مخمّس ترکیب بند۔ مخمّس ترجیع بند ۔ مسدّس ۔ مسدّس ترکیب بند۔

مسدّس جس نے سوداؔ کے بعد مرثیے کے لئے خصوصیت حاصل کر لی۔ سوداؔ سے قبل کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ جدّت سوداؔ ہی کا حصّہ ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے موجد میاں سکندر پنجاب کے رہنے والے تھے۔ یہ سوداؔ کے ہم عصر تھے۔ اِن کا ایک مسدّس نواحِ لکھنؤ میں زبان زد خاص و عام ہے۔ اِس مسدّس کے علاوہ سکندر کا اور کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ سوداؔ نے میاں سکندر کی تقلید میں مسدّس لکھا ہو۔ مرزا نے جملہ شکلوں میں مرثیہ لکھا۔ چنانچہ مسدّس بھی لکھا ہو گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ مسدّس کو چھوڑ دیا ہو۔

ایک مربع کے تین بند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :۔

کریں نہ اہلِ جہاں کس طرح سے شیون و شین　　سروں کو اپنے نہ پیٹیں سو کیوں وہ کرکے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسینؑ　　یہ تعزیہ ہے رموزِ خدا کے محرم کا

ہزار طرح سے دریا رواں تھے دنیا میں　　جو کوئی تھا سو وہ سیراب تھا ہر اک جا میں
کئی غریب جو تھے کربلا کے صحرا میں　　نصیب اُن کو نہ قطرہ ہوا کسی یم کا

---

یہ ظلم کس کی زباں کو ہے کہنے کا یارا　　نبی کا قتل کیا ظالموں نے گھر سارا
جو اُن میں طفل تھا شش ماہہ اسکو بھی مارا　　کیا نہ عمر نے کچھ فرق زائد و کم کا

---

**شعرائے مرثیہ گو** اس وقت تک مرثیہ نے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ سودا نے اوّل اوّل ادبیت کا خیال رکھ کر مرثیہ لکھا۔ اس کے بعد اُس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ ایک مستقل صنف شاعری کی حیثیت پیدا کر لی۔ اور ایک جماعت شعراء کی پیدا ہو گئی جنھوں نے اس صنف کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ چنانچہ میر خلیق، میر ضمیر، مرزا فصیح اور میاں دلگیر کو عہد حاضرہ کے مرثیہ کے ابتدائی شعراء کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

مرزا فصیح اور میاں دلگیر حج بیت اللہ کے لئے مکّہ معظّمہ تشریف لے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ میر خلیق اور میر ضمیر یہیں رہے اور اپنی کوششوں سے مرثیہ کو آسمان شہرت پر پہنچا دیا۔

**میر ضمیر** گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سودا نے سب سے پہلے مرثیہ کو مسدّس میں لکھا۔ چنانچہ میر ضمیر نے سودا کے نقش قدم پر چل کر مسدّس کو مرثیہ کے لئے انتخاب کیا۔ اور اسی پر اپنے کمالات کی بنیاد قائم کی۔ مرثیہ جو اب تک رونے رُلانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اُسے میر ضمیر نے خوشنما تشبیہوں اور استعاروں سے، روایات اور مناظر قدرت سے۔ اور سوشی، مقامی اور رزمیہ بیانات سے مالا مال کر دیا۔ سراپا کی ایجاد سے مرثیہ

میں جان ڈال دی اور طول دے کر سو سو بند تک پہنچا دیا۔ علاوہ بریں پڑھنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ پہلے سوز کے طرز پر پڑھا جاتا تھا۔ میر ضمیر نے تحت اللفظ پڑھا اور اُن کے بعد یہ روش عام ہو گئی۔

**میر خلیق** میر مستحسن خلیق خلف ارشد میر غلام حسن حسن۔ صاحب مثنوی سحر البیان۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے شعر و شاعری کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد عیال کا بوجھ اُن کے سر آپڑا۔ غزلیں بیچ بیچ کر گزارا کیا کرتے تھے۔ بڑے پُر گو شاعر تھے۔ ایک دیوان غزلوں کا مکمل کر لیا تھا لیکن اُسے رواج نہیں دیا۔ مرثیہ گوئی میں خاص شہرت تھی۔

خوبیٔ محاورہ اور لطف زبان خلیق کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ لکھنؤ میں اِن کی اور اِن کے تمام گھرانے کی زبان محاورے کے لحاظ سے مستند سمجھی جاتی تھی۔ مرثیے میں میر خلیق کی توجہ تمام تر زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت کی طرف رہتی تھی۔ سوز و گداز کو تخیل کی بلند پروازی پر مقدم سمجھتے تھے۔ اور مضمون آفرینی کی ہوس کم کرتے تھے۔ اور بقول آزاد ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ اور واہ وا کے نالہ و آہ کا زیادہ طلبگار تھا۔

**میر ببر علی انیس** میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن کے پوتے تھے۔ ۱۸۰۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے خاندانی کمال یعنی شاعری میں باپ کے شاگرد ہوئے۔ اور جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا اُس وقت سے تمام

عمر اِسی میں صرف کر دی۔

جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو رونق دی تو میر انیس بھی وہاں پہنچے۔ اور اپنے کمالات سے آدھے سے زیادہ لکھنؤ کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ میر خلیق کی زندگی ہی میں میر انیس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

انیس کا خیال تھا کہ میری شاعری کی خاطر خواہ قدر کچھ لکھنؤ والے ہی کر سکتے ہیں اور اسی خیال سے انھوں نے انتزاع سلطنت اودھ تک بیرونجات کا سفر نہیں کیا لیکن آخر واقعات نے مجبور کیا اور انھیں سفر کرنا پڑا۔ ۱۸۵۹ء اور اور ۱۸۶۰ء میں دو مرتبہ عظیم آباد گئے۔ واپسی پر کچھ روز کے لئے بنارس قیام کیا۔ ۱۸۷۱ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے اور واپسی پر الہ آباد کو شرف بخشا۔ اِن مقامات پر آپ نے اپنے مرثیے پڑھے اور ہزاروں آدمیوں سے خراج تحسین وصول کیا۔ آخر لکھنؤ میں ۱۸۷۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مکان میں دفن ہوئے۔

انیس کی کل تصانیف شائع نہیں ہو سکیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہزاروں مرثیے، سلام، رباعیاں اور قطعے تصنیف کئے۔ اشعار کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی۔ لیکن فی الحال پانچ جلدیں مراثی کی شائع ہیں اور ہر جگہ دستیاب ہوتی ہیں۔ باقی تصانیف اُن کے خاندان میں محفوظ ہیں۔

زبان کے لحاظ سے میر انیس کے مراثی کی خصوصیت، صفائی، سادگی، روانی اور فصاحت ہے۔ زبان پر قدرت کامل حاصل ہے۔ جس مضمون کو لیتے ہیں نہایت سادگی سے پُر تاثیر انداز میں ادا کر دیتے ہیں۔ زبان کی لطافت،

محاورات کی دلاویزی اور تشبیہوں کی ندرت سے کلام کو تازگی بخشتے ہیں۔

شاعری میں انیس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انسانی فطرت، جذبات اور احساسات کا مطالعہ جس قدر انیس نے کیا ہے اور کسی اُردو شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔ مسرت و غم، محبت و نفرت، رشک و حسد، بیم و رجا، رحم و غضب۔ غرض ہر دلی کیفیت کا کامل مرقع ان کے مرثیوں میں موجود ہے۔ اِن مرقعوں کی تیاری میں مختلف اشخاص کے درمیان حفظ مراتب کو انیس کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ بچے کے منھ سے وہی بات ادا کرتے ہیں جو اُس کی عمر کے شایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کے وہی خیالات ہوتے ہیں جو عورت کے ہونے چاہئیں۔ مرد، عورت، آقا، خادم، دوست، دشمن غرض ہر شخصیت میں وہی فرق ہے جو ہونا چاہیئے۔ مدعا یہ کہ کردار نگاری میں خود انیس کی طبیعت کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ کردار کا صحیح اور اصلی مرقع پیش کرتے ہیں۔ اور اس سے اُن کے مرثیوں میں ڈرامائی عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

مناظرِ قدرت، رزمیہ بیانات اور موسموں کی کیفیات جیسی میر انیس کے مرثیوں میں ہیں، اُردو شاعری اُن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ انیس ہر چیز کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں اُس کی تصویر پھرنے لگتی ہے۔ رزمیہ بیان میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ اِس لحاظ سے اگر انھیں اُردو کا فردوسی اور ہومر کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہیں۔

انیس کے بعد اُن کے بیٹے میر نفیس اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلے اور مرثیہ نگاری میں اچھا نام پیدا کیا۔ انیس کے پوتے میر جلیس بھی اچھے

شاعر ہوئے۔

**مرزا سلامت علی دبیر** مرزا سلامت علی نام۔ دبیر تخلّص۔ مرزا غلام حسین کے بیٹے۔ ۱۸۰۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں باپ کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور تحصیل علم میں مصروف ہوئے۔ عربی اور فارسی میں فضل و کمال حاصل کیا۔ شعر و سخن سے قدرتی مناسبت تھی۔ میر مظفر حسین ضمیر اُس زمانے میں مرثیہ گو شاعروں میں بہت ممتاز تھے۔ اُن کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہوتے اِن کو بھی ذوق پیدا ہوا اور یہ اُن کے شاگرد ہو گئے۔

جب انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو لکھنؤ میں دبیر کا طوطی بول رہا تھا۔ تاریخ ادب اُردو کے مطالعہ سے یہ عجیب بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ ہر دور میں دو شاعر مدّمقابل رہے ہیں۔ میر و سودا۔ مصحفی و انشا۔ ناسخ و آتش۔ ذوق و غالب۔ داغ و امیر۔ غرض مرثیہ کا دور بھی اِس خصوصیت سے مبّرا نہیں۔ ضمیر اور خلیق پہلے حریف رہ چکے ہیں۔ اب انیس و دبیر کا عہد آیا۔ لکھنؤ کے سخن شناس دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ آدھا لکھنؤ انیسیہ ہو گیا اور آدھا دبیریہ۔ لیکن خیر یہ رہی کہ انیس و دبیر، مصحفی و انشا کی طرح دست و گریباں نہیں ہوئے۔ بلکہ انیسیوں اور دبیریوں کے اُکسانے سے دونوں اُستادوں کے جوہر خوب چمکے۔ دبیر و انیس میں اگرچہ حریفانہ معرکہ آرائی رہی لیکن ایک دوسرے کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ میر انیس کے انتقال کے بعد ایک سال تک دبیر زندہ رہے۔ لیکن انھوں نے اس عرصے میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ اور کہا کرتے تھے ع طورِ سینا بے کلیم اللہ و ممبر بے انیس۔

انیس کی طرح مرزا دبیر نے بھی غدر تک لکھنؤ نہیں چھوڑا۔ غدر کے بعد مرشد آباد اور پٹنہ کا سفر کیا۔ اور آخر ۱۸۷۵ء میں وفات پائی اور لکھنؤ میں جس مکان میں سکونت تھی اُسی میں پیوندِ خاک ہوئے۔

مرزا صاحب نے چودہ پندرہ برس کی عمر سے مرثیہ کہنا شروع کیا اور تمام عمر مشقِ سخن جاری رہی پچاس پچپن برس میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔

مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں۔ یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے عجیب عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں۔ مرزا کا کلام خیال آفرینی، دقّت پسندی، جدّت بیان، شاعرانہ استدلال اور شدّت مبالغہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ مرزا زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظرِ قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری نہیں ہیں۔ اُن کے ہاں بھی انسانی فطرت کے نمونے نظر آتے ہیں مگر یہ اُن کا خاص رنگ نہیں۔ یہ انیس کا حصّہ ہے۔

مرزا دبیر کے بیٹے مرزا محمد جعفر اوج نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر نام پیدا کیا۔ اور پٹنہ، حیدر آباد اور رامپور میں اُن کی خوب قدر و منزلت ہوئی۔

---

# باب ۸

## اُردو شعر و شاعری کا چوتھا دور ( دہلی میں )

**تمہید** سلطنت مغلیہ کی جڑ کھوکھلی ہو چکی تھی۔ دہلی میں ارباب کمال کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ شعر و شاعری کا مرکز لکھنؤ ہوتا جاتا تھا۔ میر و سودا دہلی کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ مصحفی جرأت و انشار نے لکھنؤ کی صحبتوں کو گرما رکھا تھا۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہو گا کہ دہلی میں شعر و شاعری کا چراغ قطعی گل ہو چکا تھا۔ نہیں دہلی میں اب بھی کوئی نہ کوئی صاحب کمال گزشتہ عظمت و شان پر آنسو بہانے کے لئے موجود تھا۔ یوں تو حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، حکیم قدرت اللہ خاں قاسمؔ شاگرد خواجہ میر دردؔ، میاں شکیبا شاگرد میرؔ، مرزا عظیم بیگ اور شیخ ولی اللہ محب شاگرد سوداؔ، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان وغیرہم موجود تھے۔ مگر ان سب کا حال اس مختصر کتاب میں درج نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ نصیر دہلوی کا مختصر حال تمہید میں بیان کر دینا ضروری ہے۔ اوّل تو یہ کہ شاہ نصیر ذوقؔ جیسے مسلّم الثبوت اُستاد کے اُستاد تھے۔ دوسرے اُنھوں نے دکن پر وہی احسان کیا جو ولیؔ نے شمالی ہند پر کیا تھا یعنی وہاں ذوقِ شاعری کو جو ایک عرصے سے سرد ہو چکا تھا گرمایا۔ تیسری خاص بات یہ ہے کہ نصیرؔ نے شعرائے لکھنؤ کے رنگ کو دہلی میں پھیلایا۔ جس کا اثر اُن کے شاگرد ذوقؔ کے کلام میں کہیں کہیں ملتا ہے۔

**شاہ نصیر** نصیر الدین نام۔ نصیرؔ تخلص۔ شاہ غریب کے بیٹے تھے۔ چونکہ رنگت

کے سیاہ فام تھے، اس لئے گھرانے کے لوگ میاں کلّو کہتے تھے۔ وطن خاص دہلی تھا۔ شاہ غریب گوشۂ عافیت میں بیٹھے اپنے معتقد مریدوں کو ہدایت کرتے تھے۔ نصیر اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس لئے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ نصیر کی ابتدائی تعلیم نامکمل رہی۔ مگر شاعری نے اُس کمی کو کما حقہٗ پورا کر دیا۔ آپ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔

کثرت مشق اور لطفِ سخن کی بدولت شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ اور کچھ دنوں اُن کی قدردانی کے سایہ میں بسر اوقات کی۔

نصیر نے متعدد سفر کئے بخصوصاً لکھنؤ اور حیدرآباد کے۔ دو مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے اور چار مرتبہ حیدرآباد۔ اور ہر جگہ اُن کی خاطر خواہ قدر و منزلت ہوئی۔ لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا عہد دیکھا۔ اُن کے ساتھ مشاعروں میں شامل ہوئے۔ معرکوں میں غزلیں پڑھیں۔ اپنی مشّاقی کا سکّہ جمایا۔ ناسخ اور آتش جیسے مسلّم الثبوت اُستادوں کی موجودگی میں اپنے شاگرد پیدا کئے لیکن اُن معرکوں سے لکھنؤ کا رنگ کچھ کچھ اُن پر بھی اثر کر گیا۔ حیدرآباد میں بڑی قدر ہوئی۔ سیکڑوں شاگرد ہوئے۔ چار مرتبہ وہاں گئے اور چوتھی مرتبہ ایسے گئے کہ پھر وہیں کی خاک دامنگیر میں پیوست ہو گئے۔ سنہ وفات ۱۸۴۰ء ہے۔

شاہ صاحب نے خود اپنا دیوان مرتّب نہیں کیا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے کسی شاگرد نے اُن کے کلام کا مجموعہ مرتّب کیا تھا جس کو نواب صاحب رامپور نے خرید لیا تھا۔ مگر حیدرآباد میں اُن کی غزلوں کا مکمل دیوان چھپ گیا ہے۔ اُس میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں اور کچھ نہیں۔

کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ زمینیں بھی نئی نئی اور سنگلاخ نکالی ہیں جن کو سرسبز کرنا بھی انھیں کا کام ہے۔ زبان وہی ہے جو سید انشا اور جرأت کی۔ لکھنؤ کے اثر سے کہیں کہیں تصنع اور آورد سے کام لیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اس دور کے خاص خاص نمایندوں کے حالات پڑھیے۔

**شیخ محمد ابراہیم ذوق**

شیخ محمد ابراہیم نام۔ ذوق تخلص۔ شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جو نواب لطف علی خاں کے حرم کے دربان تھے۔ ذوق ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی۔ انھیں شاعری کا چسکا تھا۔ انھیں کی صحبت میں ذوق کو بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ جب کچھ مشق ہو گئی تو شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہو گئے اور اُن کے مشاعروں میں شامل ہونے لگے۔

شعر و سخن سے کچھ ایسی فطری مناسبت تھی کہ چند روزہ مشق سے شہر میں شہرت ہو گئی۔ شدہ شدہ مرزا ابوظفر کے دربار میں رسائی ہو گئی جو ان ایام میں ولیعہد تھے اور شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے وہ اپنا کلام اصلاح کے لئے انھیں دینے لگے۔

انیس سال کی عمر میں ذوق نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک پُرزور قصیدہ لکھا جس کے صلے میں اُن کو "خاقانی ہند" کا خطاب ملا۔ ابتداً ظفر انھیں چار روپیہ ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پانچ روپے کر دئے تھے۔ جب ظفر تخت نشین ہوئے تو اُن کی تنخواہ پچیس روپے اور کچھ عرصے بعد سو روپے

کردی اور خلعت اور تحفوں سے ہمیشہ سرفراز کرتے رہتے تھے۔ ایک گانوں بھی جاگیر میں دیا تھا مگر اس سے زیادہ متمتع نہ ہو سکے۔ غدر سے دو ڈھائی سال قبل ۱۸۵۴ء میں وفات پائی۔ مرنے سے چند گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا:-

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا    کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

غدر میں اِن کا تمام کلام تلف ہو گیا۔ حافظ غلام رسول ویرانؔ نے جو اِن کے شاگرد تھے محنت و کاوش کے بعد ایک مختصر دیوان مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کے بعد ذوقؔ کے سعادتمند اور فخر اُستاد شاگرد مولانا محمد حسین آزادؔ نے ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا مگر یہ بھی مختصر ہے۔ ذوقؔ کو اگر فنافی الشعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اِن کی تمام عمر شعر و شاعری میں بسر ہوئی۔ بات بات پر قصیدے لکھتے تھے۔ غزلوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اگر اِن کا کلام ضایع نہ ہوتا تو تین چار ضخیم جلدیں بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتیں۔ اب جو یہ مختصر مجموعہ نظر پڑتا ہے تو فلک کج رفتار کی ستم ظریفی پر رونا آتا ہے کہ کیا کیا جواہر پارے ہونگے کہ یوں برباد ہو گئے۔

ذوقؔ قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ متقدّمین میں سوداؔ اور متوسطین میں ذوقؔ ہیں۔ اِن کے بعد اِس صنف کی سرد بازاری ہو جاتی ہے۔ ذوقؔ کا مرتبہ اِس صنف میں سوداؔ سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ زبان کی صفائی اور تراکیب کی چستی میں اکثر سوداؔ سے آگے نکل جاتے ہیں۔

غزلیات میں ذوقؔ کا رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا ہے۔ کہیں خواجہ میر دردؔ کا انداز ہے کہیں جرأتؔ کا رنگ ہے اور کہیں سوداؔ کی جھلک

نمایاں ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ تینوں رنگ مل کر ان کا ایک خاص رنگ بن گیا ہے۔ آزاد فرماتے ہیں کہ "ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملے کے"

عام طور پر ان کے کلام میں برجستگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ، طرز بیان منجھا ہوا اور عام فہم، محاورہ اور ضرب الامثال کا صرف ایسا برجستہ اور برمحل کرتے ہیں کہ شعر کی دلاویزی بڑھ جاتی ہے۔ عام طور پر کلام میں آمد ہے لیکن کہیں کہیں تصنع اور آورد سے بھی کام لیا ہے اور یہ اُن کے اُستاد کا اثر ہے۔

اِن تمام خوبیوں کے علاوہ کلام میں اخلاقی اور صوفیانہ مضامین نہایت سلیقے سے سجائے ہیں۔ حقائق و معارف کو باتوں باتوں میں نہایت صفائی سے اس طرح کہتے ہیں کہ اُلجھاؤ پیدا ہونے نہیں دیتے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائدار کا　　چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
آنا ہے گر تو آؤ کہ سینہ سے چل کے اب　　آنکھوں میں آکے ٹھہرا ہے دم انتظار کا
ہو پاکدامنوں کو خلش گر سے کیا خطر　　کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا
اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اِس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے　　اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
رہے یوں شیشہ و ساغر وہ مکدر دونوں　　کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

نہیں جز شمع مجاور مری بالینِ مزار      نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے
کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے یہ دو ہیں عیادت والے

ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

کہوں اے ذوق کیا حالِ شبِ ہجر      کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر      مری بختِ سیہ کی تیرگی نے
شبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم      اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے      کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ سب مگر تھے      مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم      ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج      پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے      قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شورش کر      پھٹے جاتے ہیں ہمسایوں کے سینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا      مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سورہ      بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ      بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی      طلوعِ صبح سے منھ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات      یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چُوانے مُنھ میں آنسو      پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے

مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

---

## مرزا اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام ۔ مرزا نوشہ لقب ۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب تھا پہلے اسد تخلص تھا ۔ پھر بمناسبت اسد اللہ غالب غالب اختیار کیا ۔ والد کا نام عبد اللہ بیگ تھا ۔ غالب ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے ۔ ابھی نو برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے ۔ مرزا نصر اللہ بیگ، غالب کے حقیقی چچا انگریزی فوج میں رسالدار تھے ۔ اُن کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے نواح آگرہ میں مقرر تھے ۔ انھوں نے بھتیجے کی پرورش کی ۔

ابتدائی عمر آگرہ میں بسر ہوئی ۔ شیخ معظم اور میاں نظیر اکبر آبادی سے تعلیم پائی ۔ اس کے بعد ہرمزد نامی ایک ایرانی سے جو آتش پرست سے مسلمان ہوا تھا ، فارسی کی تکمیل کی ۔ اپنے چچا کے ہمراہ دہلی آئے جن کی شادی نواب فخر الدولہ جاگیر دار لوہارو کے خاندان میں ہوئی تھی مرزا خود بھی نواب فخر الدولہ کے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی سے منسوب ہوئے ۔


UNIVERSITY LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY. ALIGARH.



چچا کے مرنے کے بعد اُن کے وارثوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست میں مقرر کرادیں۔ جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی غدر تک ملتا رہا۔ پچاس روپیہ ماہوار خلعت وخطاب کے ساتھ تاریخ خاندان تیموریہ کے لکھنے کے معاوضہ میں ابوظفر بہادر شاہ نے مقرر کر دیئے تھے۔ غدر کے بعد یہ تنخواہ بند ہوگئی۔ اور بہادر شاہ سے تعلقات رکھنے کی پاداش میں پنشن بھی جاتی رہی۔ دو برس انھوں نے بڑی مصیبت میں کاٹے۔ آخر نواب یوسف علیخاں ناظم والیٔ رامپور نے سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ لیکن یہ رامپور زیادہ نہ رہ سکے۔ واپس آئے اور تین سال کی جدوجہد کے بعد پنشن جاری ہوئی اور کچھ فارغ البالی سے بسر ہونے لگی۔

۱۸۳۰ء میں مرزا کلکتہ بھی گئے تھے۔ واپسی پر لکھنؤ بھی قیام کیا، واجد علی شاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ انھوں نے پانچ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا جو انتزاع حکومت تک انھیں ملتا رہا۔

مرزا ۱۸۶۹ء میں راہیِ ملک بقا ہوئے اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا (دہلی) کے متصل پیوندِ خاک ہوئے۔

مرزا شگفتہ مزاج تھے، ذہن و ذکاوت کے ساتھ قوت حافظ بھی لاجواب رکھتے تھے۔ شوخی اور ظرافت مزاج میں بہت تھی۔ تحریر ہو یا تقریر کوئی بات ان کی لطافت وظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ طبیعت میں فیاضی، سیرچشمی اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جو وضعداری کے خلاف ہو۔ مذہبی تعصبات سے آزاد تھے۔ ہندو مسلمانوں کے ساتھ یکساں

محبت اور رواداری کا برتاؤ تھا۔ خود عقیدہ کے اعتبار سے مسلمان تھے۔ توحید اور رسالت پر پکا ایمان رکھتے تھے۔ صوفی منش انسان اور تفضیل حضرت علی کے قائل تھے۔

یوں تو مرزا کی کل فارسی اور اُردو تصانیف بارہ تک پہنچتی ہیں مگر یہاں ہمیں صرف اُردو تصانیف سے تعلق ہے سو وہ تین ہیں۔ (۱) عودِ ہندی (۲) اردوئے معلیٰ۔ یہ دونوں آپ کے خطوط کے مجموعے ہیں اور نثر میں ہیں۔ (۳) دیوان اُردو۔

مرزا فارسی کے بڑے زبردست شاعر تھے۔ اور انھیں اس پر بجا طور پر ناز بھی تھا۔ اپنے اُردو کلام کو فارسی کلام کے مقابلے میں بلند پایہ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن زمانہ کے انقلاب اور اُردو کی عالمگیری نے اُن کے فارسی کلام کو بھلا دیا اور اُردو کلام کو لوگوں نے حرزِ جاں بنایا۔

مرزا کے عہد شاہی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) وہ دور جس میں فارسیت کا رنگ اُن کی قوت متخیلہ پر خوب چڑھا ہوا تھا۔ مرزا بیدل کی روش پر چلتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے کلام کے متعلق کہا گیا ہے۔

کلام میر سمجھے اور بیانِ مرزا سمجھے　　　مگر اِن کا کہایہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لوگوں نے اس ناپسندیدہ انداز اور بے راہ روی کی مذمت کی۔ چنانچہ غالب فرماتے ہیں:۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　　سُن سُن کے اِسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(۲) اِس کے بعد اُن کے کلام میں انقلاب واقع ہوتا ہے اور وہ رنگ اختیار

کیا جاتا ہے جو عام طور پر دیوان میں موجود ہے۔ (۳) لیکن آخر عمر میں کلام بہت سہل ہو گیا ہے۔ زبان کی صفائی اور بے ساختگی اِس قدر بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا باتیں کر رہے ہیں۔

لیکن یہ امر واقع ہے کہ ان کے جیتے جی اور ایک عرصہ بعد تک بھی اُن کے کلام کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا آسان سے آسان کلام بھی اُس زمانہ کے مذاق کے خلاف تھا۔ مگر اب امتدادِ زمانہ نے ثابت کر دیا ہے کہ غالب صحیح راستہ پر تھے۔ اور غالب نے جب کہا تھا :۔ ع

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

تو گویا حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔

سب سے پہلی خصوصیت جو اِن کے کلام میں ملتی ہے وہ اِن کا ذوقِ فارسی اور ندرتِ بیان ہے۔ عام اور مبتذل تشبیہیں اِن کے کلام میں کہیں نہیں ملتیں۔ جہاں تک ہو سکتا ہے نئی نئی تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوّالہ سے وغیرہ۔

الفاظ کا انتخاب مرزا کے کلام میں لاجواب ہے۔ زیادہ سے زیادہ مضمون کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھرتی کے الفاظ کی گنجائش کہاں۔ ایک ایک مصرع میں یہ خوبی ہے کہ اگر اُس میں سے کسی لفظ کو نکال کر اُس کے بجائے دوسرا ہم معنی لفظ رکھ دو تو معنی میں فرق پڑ جائے گا۔

طرزِ ادا میں جدّت ہے۔ معمولی سے معمولی مضامین کو لیتے ہیں لیکن ندرتِ بیان کے جادو سے اُسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ اگرچہ کلام میں حُسن و عشق

کو بہت دخل ہے لیکن گل و بلبل کے پھیکے اور بے مزہ افسانے نہیں ہیں بلکہ انسانی فطرت کے عمیق ترین حقائق کے مرقعے تیار کئے گئے ہیں۔ دنیا کی سطحی چیزوں پر نظر ڈال کر مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اُن کی شاعرانہ نگاہیں ہر چیز کی حقیقت تک پہنچتی ہیں۔ حیات انسانی کے رموز کی ترجمانی جیسی غالب نے کی اب تک کسی سے نہ بن پڑی۔ فلسفہ اور تصوف کا جہاں تک شاعری سے تعلق ہو سکتا ہے آپ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ وحدت الوجود کا طرح طرح سے ذکر کیا ہے۔ غالب کو ہر چیز میں اسی ذات باری تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ غالب کے آسان سے آسان کلام میں بھی یہ جملہ خصوصیات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ اُن کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو مومن کے سوا اور شعراء میں نہیں ملتی۔ اُن کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کا شعر ہمیشہ نیا لطف دیتا ہے۔

غالب میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کے ہاں نہایت لطیف شوخی پائی جاتی ہے۔ اور ایسی شوخی جو دل میں تڑپ اور کیفیت پیدا کر دے سوز و گداز بھی کلام میں ہے مگر وہ بھی دل کی دردمندانہ کیفیت ہے نہ کہ آہ و بکا۔

اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ    صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے    سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے    مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا    میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو    اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں    تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب    گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی    آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی    بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی    حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا۔ لہو نہ تھما    کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے    لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل    زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو    میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

---

## حکیم محمد مومن خاں مومنؔ

محمد مومن خاں نام، مومنؔ تخلّص۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے۔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا شاہ عبدالقادر سے عربی پڑھی۔ اس کے بعد اپنے والد اور چچا سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اُن کے مطب میں نسخہ نویسی کرنے لگے۔ اسی دوران میں نجوم کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فن میں بھی کمال حاصل کیا لیکن نہ طب اُن کی اُفتادِ طبع کے موافق تھی اور نہ نجوم۔ عاشق مزاجی کے ساتھ شعر و سخن کی طرف میلان ہوا۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا۔ پھر بطور خود مشقِ سخن کی۔

مزاج میں رنگینی اور طبیعت میں شوخی تھی۔ خوش وضع اور خوش پوشاک عاشق مزاج آدمی تھے۔ لیکن دینداری سے بھی خالی الذہن نہ تھے۔ جوانی میں سیّد احمد صاحب شہید سعید کے مرید ہوئے اور آخر وقت تک عقائد میں انھیں کے پیرو رہے۔

تاریخ گوئی میں بڑا کمال پیدا کیا تھا۔ تعمیہ و تخرجہ سے وہ وہ تاریخیں کہیں ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کی تاریخ ملاحظہ ہو:-

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

قصائد بھی کلیات میں موجود ہیں۔ درجہ میں بھی بلند ہیں۔ لیکن انھوں نے صلہ کی اُمید پر ارباب دنیا کی مدح کبھی نہیں کی۔ دیوان میں مخمس، مسدس، ترجیع بند، مرثیہ وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ کلیات کئی بار چھپ چکا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔

مومن نے متعدد سفر بھی کیئے۔ رامپور بھی گئے۔ اور جہانگیر آباد بھی۔ مگر کہیں قیام نہیں کیا۔ بقول میر:-

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ان کے ذوقِ نظر سے دلّی کی گلیاں کب چھوٹتی تھیں۔ آخر اسی خاک پاک سے ۱۸۵۱ء میں ملکِ بقا کو سدھارے۔ اور دلّی دروازے کے باہر حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔

مومن بڑے پایہ کے شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد ہوئے ہیں۔ اُن کی زبان کی بڑی خصوصیت اُن کا ذوقِ فارسی ہے۔ ایسی نئی نئی اور انوکھی فارسی ترکیبیں بے تکلفی سے استعمال کر جاتے ہیں کہ خیال میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہوتے ہیں۔ عاشقانہ جذبات

وخیالات میں ندرتِ بیان سے وہ لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کرتے ہیں کہ فرسودہ سے فرسودہ مضامین میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی رنگینی نزاکت خیال میں اور بھی رنگینیاں بھر دیتی ہے۔ جہاں صفائی پر اُترتے ہیں وہاں جرأت کا دھوکا ہوتا ہے۔ اور جہاں بلند خیالی پر تُلتے ہیں وہاں اپنی نظیر آپ ہوتے ہیں۔

اِن کے ہاں خاص طور پر یہ بات نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں۔ جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سُننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ یہ بڑا نازک پہلو ہے۔ ذرا سی بے اعتدالی سے کلام پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مومن نے اِسے اس سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں پیچیدگی اور اُلجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور خاص انداز مومن کے ساتھ مخصوص ہے ۔ وہ یہ ہے کہ کہیں کہیں آپ محبوب سے وہ بات کہتے ہیں جس میں بظاہر محبوب کا فائدہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں خود عاشق کا فائدہ منصوّر ہوتا ہے ۔ مثلاً

غیروں پہ کھُل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

مومن اپنے تخلص کو مقطع میں اس طرح کھپاتے ہیں کہ لفظ مومن اپنے معنی دینے لگتا ہے اور شعر کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

غیروں پہ کھُل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا
اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا
بد کام کا مآل برا ہے جزا کے بعد — حالِ سپہر تفرقہ انداز دیکھنا
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیئے ستانے کو
صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا — سو مرے خاک میں ملانے کو
کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں — آسماں کے ستم اٹھانے کو
چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
اس بت کے لیے میں ہوسِ حور سے گزرا — اس عشقِ خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح — طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ — بدنامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکیِ دامن کے گواہی مرے آنسو    اس یوسفِ بیدرد کا اعجاز تو دیکھو
جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

# تبصرہ

اُردو شعر و شاعری کے اِس چوتھے دَور کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایسا محض سہولت کو مدِ نظر رکھ کر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اِس کی ضرورت بھی تھی شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ دونوں مقامات کی شاہراہیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ رنگ شاعری حضرات لکھنؤ اور دہلی میں پورب پچھم کا فرق ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ اِن دونوں اسکولوں کی الگ الگ خصوصیات اور ان کا باہم فرق بتا دیا جائے۔ اِسی ضمن میں اس مکمل دَور کی خصوصیات اور اہمیت پر بھی روشنی پڑ جائے گی۔

لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کی خصوصیات اور اُن کا باہمی فرق سمجھنے کے لئے اِن دونوں مقامات کے ملکی، سیاسی اور سوشل حالات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ملکی، سیاسی اور سوشل حالات علم و فن ہی پر نہیں بلکہ مکمل حیاتِ انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر انسان مع اپنے جملہ علم و ہنر، اعمال و کردار کے اِنھیں سوشل حالات کا پرتو ہوتا ہے۔ افراد کا مذاق۔ اُن کا میلانِ طبع۔ اُن کی شاعری بلکہ اُس

شاعری کا ایک ایک لفظ انھیں حالات، کیفیات اور ماحول کی کارفرمائی کا آئینہ ہے۔

شمالی ہند میں اُردو شعر و شاعری کی ابتدا ولی کے دہلی آنے یعنی ۱۷۲۲ء سے ہوئی۔ ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا چراغ چراغ سحری بنا ہوا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں گو درخت ہرا بھرا نظر آتا تھا لیکن جڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ہرا بھرا درخت بھی سوکھنا شروع ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر اعظم کی اولاد شاہ شطرنج بن کر رہ گئی۔ اور اُن کی قلمرو سکڑ کر قلعہ معلیٰ دہلی میں سما گئی۔ آخری دو بادشاہ محض وظیفہ خوار تھے۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت کا یہ حال ہو تو رعایا کا حال اس سے بھی ابتر ہو گا۔ دہلی اور گرد و نواح کا علاقہ گویا ایک جہاز تھا۔ آگے خطرناک بھنور اور پیچھے طوفان باد و باراں۔ ایسی حالت میں کہاں کی نیند اور کہاں کے عیش و عشرت۔ نان شبینہ ہی کے لالے تھے۔

مشہور ہے کہ انسان رنج و غم کی حالت میں فلسفی اور مذہبی آدمی بن جاتا ہے۔ اُس کی نگاہیں سطح سے گزر کر دل کی گہرائیوں میں اُترنے لگتی ہیں۔ حیات اور اُس کے لوازم پر غور و خوض کرنے کا اُس میں مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔

شعرائے دہلی کو یہ فضا نصیب ہوئی۔ چنانچہ اُن کا کلام اِن ہی کیفیات کا حامل ہے۔ صوفیانہ خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ کلام میں سوز و گداز دل کی اصلی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بات ہے دل سے نکلی ہوئی ہے اور اسی لئے اثر رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ حقیقی معنوں میں شاعر ہیں۔ بعض شاعر

ایسے بھی نظر آئیں گے جو ہنسنے اور ہنسانے کی کوشش کریں گے۔ مگر اُن کا ہنسنا زہر خندہ سے زیادہ نہیں۔

چوتھے دور کے شعراء ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اُس پُر آشوب عہد کے شعراء ہیں جس میں ہنگامۂ غدر نے رہی سہی شاہی بساط بھی اُلٹ دی تھی۔ ذرا اُن شعراء کے کلام کا غور سے مطالعہ کرو۔ لفظ لفظ میں سوز و گداز اور حرف حرف میں دردمندانہ کیفیت موجود ہے۔ دماغ سوچنے کی، دل محسوس کرنے کے اور نگاہیں تہ میں بیٹھ جانے کی عادی ہیں۔ جو بات کہتے ہیں دل سے نکلی ہوئی اور اثر میں ڈوبی ہوئی۔ اُن کا عشق سچا ہے۔ اُن کا معشوق حُسن ہے۔ کوئی حسین نہیں۔ تعریف حُسن کی ہے کسی حسین کی نہیں۔ غرض یہ کہ عشق و حُسن کے ظاہری لوازمات پر اُن کی نظر نہیں ٹھہرتی۔

میرؔ و سوداؔ کے عہد سے دہلی اُجڑنی شروع ہوئی۔ جسے دیکھئے لکھنؤ کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ آخر لکھنؤ میں وہ کیا بات تھی کہ ہر کس و ناکس کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ اودھ میں نسبتہً امن و امان کا دور دورہ تھا۔ والی فیاض اور علم و فضل کے قدردان تھے۔ دولت کی فراوانی تھی اور اُسے بے دریغ خرچ کیا جاتا تھا۔

شاہانِ اودھ میں نواب سعادت علی خاں خود شاعر اور شاعروں کے قدردان تھے۔ اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر بھی شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اُن کے بیٹے نصیر الدین حیدر بھی شاعر تھے۔ مزاج میں لااُبالی اور

لہو ولعب حد سے زیادہ تھا۔ مے نوشی حد اعتدال سے متجاوز ہو گئی تھی۔ دس برس اور پانچ روز سلطنت کی اور اس قلیل مدت میں محاصل ملک کے علاوہ بیس کروڑ روپیہ منجملہ اندوختہ نواب سعادت علی خاں صرف میں آیا۔ نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور اُن کے بعد امجد علی شاہ اور سب سے آخر میں واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ انھوں نے تو ہر بات کی حد کر دی۔ بیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ مصاحبوں نے کمسن اور ناتجربہ کار سمجھ کر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ اور آخر واجد علی شاہ کو جانِ عالم پیا کر کے چھوڑا۔ دو کروڑ روپیہ لگا کر قیصر باغ بنوایا۔ جو حقیقت میں عیش منزل اور عشرت کدہ تھا۔ ہزاروں مہ لقا رشکِ حور اربابِ نشاط سے رشکِ ارم بنا ہوا تھا۔ اور واجد علی شاہ اُن کے حسن وشباب کے تنہا مالک تھے۔ اِن بے اعتدالیوں کا جو نتیجہ خود بادشاہ کے حق میں ہوا وہ اِس کتاب کے موضوع سے خارج ہے البتہ جو نتیجہ اُردو ادب، کے لئے مترتب ہوا اُس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

بادشاہوں کی حالت کا دھندلا سا نقشہ دیکھ چکے۔ خود سمجھ لو کہ رعایا کی کیفیت کیا ہوگی۔ بچہ بچہ اِسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ عام عیش وعشرت، بے فکری، فراوانیٔ دولت، اِس عہد کی خصوصیات ہیں۔

جہاں رنج وغم کی حالت میں انسان مذہبی اور فلسفی بن جاتا ہے، وہاں خوشی، مسرت اور بے فکری کی حالت میں سُبک خیال اور چھچھورا بن جاتا ہے۔ یاس عظیم آبادی کیا خوب فرماتے ہیں ؎

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے      وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

خیالات میں گہرائی نہ ہو اور ہزاروں مہ جبین روبرو عشوہ فروش ہوں تو نگاہیں مویاف، انگیا اور ڈوپٹے میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں تو کیا کریں۔ آرزوئیں ہجر و فراق کی خوگر نہ ہوں اور جام وصال کا دور چل رہا ہو تو عشق بوالہوسی کا مترادف کیوں نہ بنے۔ شربتِ وصال نے آتشِ دل کو سرد کر دیا ہو تو جذبات کہاں سے پیدا ہوں۔ اور جب جذبات پیدا نہ ہوں تو اندازِ بیان میں صفائی، سادگی اور صداقت کیونکر پیدا ہو۔ ناچار تکلف، آورد اور تصنع سے کام لینا پڑتا ہے۔ مضمون کے تارے آسمان سے اُتارنے پڑتے ہیں۔ موشگافیاں کی جاتی ہیں۔ کوہ کنی کرنی پڑتی ہے اور جوئے شیر کے عوض گھاس کا تنکا نکال کر لایا جاتا ہے۔ اور جب اِن تکلفات لایعنی سے بھی کام نہیں چلتا اور اثر پیدا نہیں ہوتا تو پھبتی کے زور سے اور ضلع جگت کی مدد سے لوگوں کے دلوں پر کاوشِ جستجو اور دقتِ نظر کا سکہ بٹھایا جاتا ہے۔ آخر تسلیم گھبرا کر چلا اُٹھتے ہیں ؎

میں ہوں اپنے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی      مجھکو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

لیکن اِن تکلفات باردہ سے زبان اُردو نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ خوب منجھ کر صاف ہوئی اور اُس کی وسعت بڑھ گئی۔ اور انصاف تو یہ ہے کہ دہلی کی نسبت لکھنؤ کی زبان میں زیادہ فصاحت، زیادہ بلاغت، زیادہ لطافت اور زیادہ وسعت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ حسرت موہانی نے از رہِ انصاف ایک شعر میں دہلی کی شاعری اور لکھنؤ کی زبان کی تعریف کی ہے ؎

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود　　تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

واضح ہو کہ لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کا جو یہ فرق دکھایا گیا ہے وہ اب موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کاغذ کی ناؤ ہمیشہ نہیں چل سکتی۔ جب وہ بے اعتدالیاں حد سے بڑھ گئیں تو بقول حفیظ جالندھری ؎

تنزل کی میں انتہا چاہتا ہوں　　کہ شاید یہی ہو ترقی کا زینہ

شعرائے لکھنؤ ہی میں سے چند برگزیدہ شعراء نے علم بغاوت بلند کیا اور اُن سب بے عنوانیوں کا قلع قمع کر کے رکھ دیا۔ اُن برگزیدہ شعراء کا تذکرہ آئندہ ادوار میں آنا ہے۔ آج لکھنؤ اور دہلی کی شاعری ایک ہے۔ البتہ زبان میں کچھ فرق ہے اور وہ بھی فروعی یعنی چند الفاظ کی تذکیر و تانیث اور چند الفاظ کے تلفظ کے متعلق۔

آخر میں اگر اُردو کی مایۂ ناز صنف مرثیہ نگاری کی طرف اشارہ نہ کیا گیا تو بحث نامکمل رہ جائے گی۔

واضح ہو کہ شاہانِ اودھ اعتقاداً و عملاً امامیہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ اور مضافات میں مذہب امامیہ کا زیادہ رواج تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں صنف مرثیہ نگاری کو بڑا فروغ ہوا۔ فروغ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ صنف ترقی کر کے باقی تمام اصناف پر فوقیت لے گئی۔ برخلاف اس کے دہلی میں مرثیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ غالب نے کوشش کر کے ایک مرثیہ لکھا مگر انصاف کہتا ہے کہ شعرائے دہلی خواہ امامیہ مذہب ہی سے تعلق رکھتے ہوں اس میدان کے مرد نہیں۔

مرثیہ کی عالمگیری اور ہر دلعزیزی نے لکھنؤ کی غزل پر ایک خاص اثر ڈالا جو اُسی زمانے تک محدود نہیں رہا بلکہ آجکل بھی پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ سوز و گداز کو جو غزل کی جان تھی آہ و بکا اور نالہ و فریاد میں تبدیل کر دیا۔ بعض شعرا کے کلام پر مرثیت چھا گئی۔ علالت، موت، آہ و زاری اور ماتم کے مضامین اس کثرت سے بندھے کہ خاص خاص الفاظ اور اصطلاحیں زبان زد خاص و عام ہو گئیں۔ مثلاً عشق کو مرض کہا گیا ہے اور اضطراب شوق کو نزع، نزع کے بعد موت کا آنا لازمی ہے اور موت پر ماتم کرنا ضروری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غزل کی صاف او شیریں زبان میں وہ وہ الفاظ آ گئے جو غالباً مرثیہ ہی کے لئے موزوں تھے۔ مثلاً نوحہ، ماتم، میّت، جنازہ، تُربت، گورِ غریباں، لوحِ مزار وغیرہ۔

اگلے صفحہ پر بطور خلاصہ دہلی و لکھنؤ اسکولوں کی خصوصیات کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے :-

دیکھو صفحہ ۱۲۵

| بہ لحاظ | دہلی اسکول | لکھنؤ اسکول |
|---|---|---|
| زبان | صاف، سادہ، رواں، بے تکلف | پُرتکلف، تصنع، آورد، صنائع وبدائع، اظہار علم وفضل۔ |
| شاعری | جذبات و احساسات | مضمون آفرینی، خیال بندی۔ |
| | اثر | بے اثری |
| | تصوف وفلسفہ | × |
| | اخلاق پُراثر | اخلاق شاعرانہ استدلال اور تمثیل میں ڈوبا ہوا۔ |
| | عشق | ہوس |
| | حُسن کی تعریف | لوازمات حُسن کی تعریف۔ |
| صنفِ شاعری | × | مرثیہ (جذبات نگاری ــ کردار نویسی۔ اخلاق منظر نگاری، رزمیہ بیانات مسلسل روایات) |
| خدمت زبان | زبان کی نزاکت، خوشنما فارسی تراکیب محاورات وضرب الامثال۔ | زبان کی صحت۔ اصول کی پابندی۔ متروکات قواعد تذکیر وتانیث۔ |

# باب ۹

## اُردو شعر و شاعری کا پانچواں دور

**تمہید** | گذشتہ ابواب میں متعدد بار اشارۃً عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء سے بہت قبل دہلی کی حالت خراب ہو چکی تھی تاہم خاندانِ مغلیہ کے آخری چشم و چراغ اپنی ہمت سے زیادہ اربابِ ہنر کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ بہادر شاہ اگرچہ پنشن خوار تھے لیکن شعراء کی پرورش کرتے رہتے تھے۔ ہنگامۂ غدر نے اُن رہے سہے قدردانوں کو بھی نیست و نابود کر دیا۔ دہلی سے اُجڑنے والوں کا ملجا و ماوا لکھنؤ تھا۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں انتزاعِ سلطنت اودھ کے بعد لکھنؤ کی بھی وہ حالت نہ رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی اور لکھنؤ کے شعراء خانماں برباد اِدھر سے اُدھر پھرنے لگے۔ انگریزی حکومت کے اربابِ حل و عقد زبانِ اُردو اور اُس کے ادب کی قدر و قیمت کیا سمجھ سکتے تھے۔ لے دے کے چند دیسی ریاستیں تھیں جہاں شعر و سخن کی اس گئی گزری حالت میں بھی قدر کی جاتی تھی۔ چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے شعراء نے رامپور، حیدرآباد، جے پور، ٹونک اور دیگر ریاستوں کا رُخ کیا۔ اور کسی نہ کسی طرح تنگی ترشی سے زندگی کے بقیہ ایام گزار دئے۔

**شعرائے دہلی** | شعرائے دہلی جو غدر کے بعد تلاش معاش میں سرگرداں

اِدھر اُدھر بکھرے تین ہیں۔ (۱) ظہیر (۲) انور (۳) داغ۔

**شعرائے لکھنؤ** لکھنؤ کے شعراء کی ایک بڑی تعداد تو مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ کے ہمراہ تھی۔ باقی چند اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ جن میں سے بحر، منیر، قلق، اسیر اور امیر نواب صاحب رامپور کی ادب نوازی کے سایہ میں رامپور پہنچے۔

قبل اس کے کہ اس دَور کے دو خاص نمایندوں یعنی داغ دہلوی اور امیر لکھنوی کا تذکرہ کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر اور انور کا مختصر تذکرہ اس تمہید میں کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ دو ہستیاں وہ ہیں جنھوں نے ٹونک اور جے پور میں مذاق شاعری کو عام کر کے وہاں شعراء کی ایک جماعت پیدا کر دی۔

**ظہیر** سید ظہیر الدین نام۔ ظہیر تخلص خلف سید جلال الدین حیدر خوشنویس دہلی کے رہنے والے اور ذوق کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد مختلف مقامات میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد رامپور پہنچے اور چار سال وہاں قیام کیا۔ اُس کے بعد دہلی واپس آئے۔ یہاں کچہری میں ایک معمولی آسامی پر آپ کا تقرر ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد "جلوۂ طور" بلند شہر کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی دَوران میں مہاراجا شیو دیان سنگھ والیٔ الور نے آپ کو طلب کیا۔ چار سال آپ وہاں رہے لیکن کسی وجہ سے وہ مقام بھی راس نہ آیا۔ غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور پولیس میں آپ کسی آسامی پر مامور ہوگئے۔ جہاں انیس سال تک آپ رہے۔ مہاراجا رام سنگھ والیٔ جے پور کے مرنے کے بعد آپ ٹونک گئے۔

اور چودہ سال وہاں مقیم رہے۔ آخر میں آپ حیدرآباد پہنچے۔ مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور اُمیدواری کے دوران ہی میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ تاریخ وفات ۱۹۱۱ء ہے۔

ظہیر بڑے پائے کے شاعر تھے۔ اگرچہ ذوق کے شاگرد تھے لیکن اُن کے کلام میں مومن کا رنگ زیادہ ہے۔ اُن کے تین دیوان شایع ہو چکے ہیں۔ چوتھا دیوان اُن کے خاندان میں محفوظ ہے۔

**انور** سیّد شجاع الدین نام۔ امراؤ مرزا عرف۔ انور تخلص۔ ظہیر کے چھوٹے بھائی اور ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کی وفات کے بعد غالب کو بھی کلام دکھایا ہے۔ طبیعت نہایت دقّت پسند اور مضمون خیز پائی تھی۔ طرزِ مومن کے پورے پورے مقلد اور غالب کے استعارہ بالکنایہ کی خوش اسلوب ترکیب کے پیرو تھے۔ الغرض ذوق، غالب اور مومن کے جُداگانہ طرزوں کو سمو کر ایک خاص رنگ ایجاد کیا تھا۔

دستبردِ غدر سے پریشان ہو کر جے پور جا رہے تھے۔ آخر وہیں ۴۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یوں تو انور کی اُستادی کا سکّہ جے پور میں اب تک رائج ہے اور رہے گا۔ لیکن اُن کے فخرِ اُستاد شاگرد مولانا اشفاق رسول جوہر گزشتہ سال ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے۔ خاکسار راقم الحروف نے حضرت جوہر کا کلام خود انھیں کی زبانی سُنا تھا۔ ایک شعر ہدیۂ ناظرین ہے:—

جدھر جھک گئی وہ ہی کعبہ ہوا ۔۔۔ جبیں اپنی قبلہ نما ہو گئی

انور بہت پُرگو شاعر تھے۔ لیکن اُن کا کلام بہت کچھ ضائع ہو گیا۔

لالہ سری رام دہلوی مؤلف "خمخانۂ جاوید" نے ایک دیوان مرتب کرکے شائع کیا تھا۔
جس کے متعلق مؤلف فرماتے ہیں کہ اُن کے کلام کا آٹھواں حصّہ بھی نہیں ہے۔
اِسی طرح مولانا جوہر مرحوم نے بھی ایک مجموعہ کلام آنور کا شائع کیا تھا۔ تبرک کے طور
پر ایک شعر آنور کا ملاحظہ ہو:۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے    پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

---

**داغ دہلوی**

نواب مرزا خاں داغ دہلوی ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی عمر کے چھ سات سال ہی گزرے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔
اِن کی والدہ نے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا فخرو سے نکاح کر لیا۔ اس طرح قلعہ معلی
دہلی سے آپ کا مستقل تعلّق ہو گیا۔ اور اس تعلّق کی بدولت جو خصوصیت اور آسانیاں
تعلیم میں آپ کو نصیب ہوئیں وہ عام طور سے اور لوگوں کو میسّر نہیں آسکتیں۔
سپاہگری کے جملہ فنون کے علاوہ شعر و سخن کا شوق طبیعت میں پیدا ہوا، قلعہ معلی میں
شاعری کی گرم بازاری تھی۔ آپ کی خداداد ذہانت اور ہونہار طبیعت کا رجحان
اس طرف زیادہ رہا۔ ذوقؔ بادشاہ اور ولیعہد کے اُستاد تھے۔ داغ بھی اُنھیں
کے شاگرد ہوئے۔ اُس وقت آپ کا سن گیارہ بارہ برس کا تھا۔

ہنگامۂ غدر سے دس ماہ پیشتر ولیعہد مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ اور پھر
غدر نے عیش و عشرت کی بساط کو تہ کر دیا۔ اس انقلاب کے بعد مرزا مع اپنے
قبائل کے رامپور چلے گئے۔ اور نواب یوسف علی خاں کے سایۂ عاطفت میں
پناہ گزیں ہوئے۔ نواب صاحب اپنی حیات تک بطور مہمان نوازی سلوک

کرتے رہے۔ اُن کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی وہی قدر دانی کی۔ اور مرزا صاحب کو اپنی مصاحبت میں رکھا۔ اور بطور معتمد خاص کارخانہ جات، اصطبل وگاڑی خانہ وغیرہ سپرد کیا۔ ۲۴ سال تک مصاحبت کے ساتھ اُن خدمات کو نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے۔

رامپور میں نواب یوسف علی خاں ناظم کے زمانہ سے شعر وسخن کی گرم بازاری تھی۔ غالب، حیا، ہجر، قلق، عروج، اسیر، منیر، تسلیم، جلال، امیر مینائی وغیرہم سب نامی شعرا ریاست کے دعاگو تھے۔ اور بجز غالب مرحوم سب وہیں قیام رکھتے تھے۔ مشاہیر اُمرا کے ہاں اور خاص نواب صاحب کی طرف سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سرکاری مشاعروں کا اہتمام و انتظام مرزا داغ صاحب ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ اور مشاعرے میں اُن کی غزل پر لوگوں کی نگاہیں رہا کرتی تھیں۔

چالیس سال کے قیام کے بعد آپ نے رامپور کو خیرباد کہا۔ مختلف شہروں کی سیر وسیاحت کے بعد حیدرآباد پہنچے۔ تین سال کی اُمیدواری کے بعد میر محبوب علی خاں نظام دکن کے اُستاد مقرر ہوئے۔ ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ اور ورود حیدرآباد کے وقت سے اُس تاریخ تک ایک ہزار روپیہ ماہوار کے حساب سے مرحمت فرمایا گیا۔ گویا نقصانات کی تلافی بھی شاہانہ الطاف کی بدولت کماحقہ ہوگئی۔ علاوہ اس مقررہ وظیفے کے وقتاً فوقتاً جو عطیات شاہی ہوئے اُن کی تفصیل بیکار ہے۔ آخر اٹھارہ برس حیدرآباد میں بعزت وآبرو بسر کرکے ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر

دارِفانی سے انتقال فرمایا۔

مرزا صاحب کے تین دیوان اور ایک مثنوی مطبوعہ موجود ہیں ۔ اور چوتھا دیوان یادگار داغ بھی تیار تھا۔ چاروں دیوانوں میں "گلزار داغ" اور آفتاب داغ" زمانۂ قیام رامپور کے چھپے ہوئے ہیں۔ اِن دیوانوں میں اکثر وہی غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں کہی گئی تھیں۔ "مہتاب داغ" حیدرآباد کے قیام کا نتیجہ ہے۔ مثنوی" فریاد داغ" زمانہ قیام رامپور میں کہی گئی تھی۔ "یادگار داغ" نامی چوتھا دیوان مرزا داغ کی وفات کے بعد لاہور سے چھپ کر شائع ہوا۔

مرزا داغ غزل گوئی کے مسلم الثبوت اُستاد اور اپنے طرز میں بے نظیر شاعر تھے۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ اُن کے کلام کا خاص رنگ سہل ممتنع، فصاحت، روزمرّہ کی صفائی، شوخی مضمون اور بیان کی نُدرت ہے۔ زبان صاف شُستہ، اور بندش برجستہ، با ایں ہمہ مضمون میں شوخی اور تیکھاپن اس درجہ ہے کہ شعر بے مثل ہو جاتا ہے اور دل میں چٹکی لئے بغیر نہیں رہتا۔ حُسن و ادا کے دلفریب نظارے، اختلاط کی نوک جھونک کے مضمون جس صفائی اور نفاست سے اُن کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں وہ اُنھیں کا حصّہ ہے۔ چونکہ کلام میں معاملہ بندی، شباب اور سرمستی کی تصویریں جابجا ہیں، لہذا کہیں کہیں یہ تصویریں عریاں بھی ہو گئی ہیں۔ اور کہیں کہیں شوخی حد سے تجاوز کر کے ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

مرزا صاحب کی شہرت خاص و عام اور قبول دوام کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں شعراء کی کثیر تعداد آپ کے تلمذ

سے مستفید ہوئی اور جس قدر اچھے شاعر آپ نے ملک میں پیدا کئے اس کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی۔ کل شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے جن میں سے بعض ارشد تلامذہ کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں:- بیخود بدایونی۔ احسن مارہروی۔ نوح ناروی۔ نسیم بھرتپوری۔ بیخود دہلوی۔ آغا شاعر دہلوی۔ آزاد۔ حیرت۔ باغ سنبھلی۔ جگر مراد آبادی۔ ڈاکٹر اقبال۔ سائل دہلوی وغیرہم۔

بطور نمونہ چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ۔۔۔ اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا ۔۔۔ تمھیں منصفی سے کہدو تمھیں اعتبار ہوتا

ترے وعدہ پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے ۔۔۔ اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی ۔۔۔ نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا ۔۔۔ جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ ۔۔۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

---

## شاگردانِ داغ دہلوی

**بیخود دہلوی** سیّد وحید الدین نام۔ بیخود تخلّص، خاص دہلی کے رہنے والے۔ داغ کے شاگرد بلکہ جانشین اور اس رنگ کے اُستاد ہیں۔ داغ اُن کی زباندانی اور مہارتِ فن کا اعتراف کیا کرتے تھے۔ داغ کی زبان اِن کی زبان ہے۔ فصاحتِ روزمرہ کے ساتھ خیال بندی کی طرف زیادہ میلان ہے۔

بڑے خلیق، ملنسار، زندہ دل اور پابند وضع شخص ہیں۔ مگر فی الحال پیرانہ سالی کے ساتھ ٹیا محل دہلی میں گوشہ نشین ہیں۔ اور مشاعروں میں شاذ و نادر ہی رونق افروز ہوتے ہیں۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

نگاہ غیر کی جانب خطاب ہے مجھ سے　　تری قسم کا یقیں اب ضرور میں نے کیا
تمنا سی شاطر نہ دیکھی نہ دیکھیں　　تصور میں نقشے جماتی ہے کیا کیا
نہ دیکھا تھا جو بزم دشمن میں دیکھا　　محبت تماشے دکھاتی ہے کیا کیا
ٹوٹنے سے اور پیدا دل میں جوہر ہو گیا　　قیمتی شیشہ ہمارا بال پڑ کر ہو گیا
کیا اسی کا نام الفت ہے کہ جب دیکھا اُسے　　خود بخود اک جوش پیدا دل کے اندر ہو گیا
ناپ لیجے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ　　اب تو یہ فتنہ قیامت کے برابر ہو گیا
آنکھ کہتی ہے کہ اب برباد کرتے ہیں تجھے　　منھ سے یہ ارشاد ہے دل میں ترا گھر ہو گیا

---

**سائل دہلوی**

ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں المتخلص بہ سائل دہلوی خاندانی وقار کے ساتھ ذاتی قابلیت کے مالک ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے داماد اور اُن ہی کے شاگرد رشید ہیں۔ ۶۷ - ۶۸ سال کی عمر ہے اور لال کنواں واقع دہلی میں اقامت گزیں ہیں۔

سائل حسن صورت اور وجاہت شخصی کے ساتھ وضعداری، اخلاق اور خلوص کی صفات سے متصف ہیں۔ راقم الحروف آپ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا ہے۔ نہایت شگفتہ طبیعت پائی ہے اور زباندانی تو خاص آپ کا حصہ ہے۔ اُردوئے معلےٰ کے اِتنے گنے نام لیوا بزرگوں میں آپ کا دم غنیمت ہے۔

اِن چند بزرگوں کے بعد وؔلی کا نام ہی نام رہ جائیگا۔

سائلؔ صاحب کو جملہ اصنافِ سخن پر قدرت حاصل ہے مگر غزل میں مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ محاورہ کی خوبی، روزمرّہ کی صفائی، سلاست اور روانی آپ کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ آپ کی غزل حدودِ غزل سے باہر نہیں نکلتی۔ حسن وعشق کے علاوہ فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کو اس میں دخل نہیں۔ کلام میں شوخی کی نمکینی اور شگفتگی کی شیرینی عجب لطافت پیدا کر دیتی ہے۔ بتذل اور عامیانہ مضامین سے آپ کا کلام پاک ہوتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایسے الفاظ لے آتے ہیں جو اکثر عوام ہی کی زبان سے سُنے جاتے ہیں۔

سائلؔ مومنؔ کی طرح مقطع میں اپنے تخلّص کو خوب کھپاتے ہیں۔ اس طرح کہ مقطع اور تخلّص دونوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ کلام ہنوز شائع نہیں ہوا۔ اگر کبھی ہوا تو کئی جلدوں میں ہوگا۔ نمونہ یہ ہے:-

عارض بھی سرخ سرخ ہیں لب لال لال بھی
شانِ جمال بھی ہے نمایاں جلال بھی

توبہ بھی کرنی پڑتی ہے پی کر اسے مدام
نام اس کا ہے بھی ہے عرقِ انفعال بھی

فصلِ گل اب آگئی وحشت کا ساماں دیکھئے
سنگِ طفلاں دیکھئے خارِ بیاباں دیکھئے

دعوئ آہن گدازی میرا اگر باور نہیں
تیر کچھ دل میں چبھو کر اُن کے پیکاں دیکھئے

کیوں کسی سے پوچھئے خستہ سری کا ماجرا
قفل کھلوا کر درو دیوارِ زنداں دیکھئے

ہمیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخمِ جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے

اہلِ محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں
بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

---

## آغا شاعر قزلباش دہلوی

محلہ گندہ نالہ واقع دہلی میں اقامت گزیں ہیں۔ داغ کے رنگ کو چمکانے والے شاعر اور شاعر گر اُستاد ہیں۔ کلام میں شوخی کی انتہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں عامیانہ پن بھی پایا جاتا ہے۔ محاوروں کے نظم کرنے کا بہت شوق ہے اور یہی شوق بعض اوقات عامیانہ محاوروں کے استعمال پر بھی مجبور کردیتا ہے۔ کلام شائع نہیں ہوا۔ نمونہ یہ ہے :-

پی پلا کر اُسے رحمت کی قسم دیتے ہیں ۔۔۔ کیسے بندے ہیں کہ اللہ کو دم دیتے ہیں
اُن کے بھروں میں نہ آجایئے گا بندہ نواز ۔۔۔ مفت کا آپ کو اغیار بھرم دیتے ہیں
داغ دیتے ہو جو دل پر تو ذرا ٹھنڈک سے ۔۔۔ مُہر کے واسطے کاغذ کو بھی نم دیتے ہیں

جب مرے ہونٹوں سے لعل شکریں جھوٹے ہوئے ۔۔۔ لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے
بزم دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے ۔۔۔ ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے
وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی ۔۔۔ دو ہی دن گزرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے

---

## نوح ناروی

محمد نوح نام۔ نوح تخلص۔ موضع نارہ ضلع الہ آباد کے رئیس اور حضرت داغ دہلوی کے جانشین ہیں۔ الہ آباد اور اطراف میں ایک بڑی جماعت شعرا کی آپ کے دامنِ فیض میں پرورش پا رہی ہے۔ چنانچہ منشی شکھدیو پرشاد صاحب بسمل الہ آبادی آپ کی اُستادی کو مسلم کررہے ہیں۔

حضرت نوح کے کلام میں فصاحت، صفائی اور سلاست تو وہی ہے جو حضرت داغ کے کلام میں ہے لیکن شوخی اور تیکھاپن نہیں۔ غزلیات میں

فلسفیانہ اور صوفیانہ پیچیدگیاں تو نہیں لیکن خیالات میں کچھ عمق ضرور ہے۔ بعض اوقات الفاظ اور جملوں کو دُہرا کر شعر میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

شوق کہتا ہے کہ برقِ حُسنِ جاناں دیکھئے
دیکھنا مشکل ہو لیکن تا بہ امکاں دیکھئے

عالمِ جوشِ جنوں کے دونوں منظر ایک ہیں
ہاتھ میں دامن کہ دامن میں گریباں دیکھئے

ہو اگر ذوقِ نظر تو کیا ہے جلوؤں کی کمی
لاکھ پردوں میں ضیائے شمعِ عرفاں دیکھئے

دل اُلجھ کر رہ گیا کُھل کر یہ میں کہتا نہیں
احتیاطاً آپ اپنی زلفِ پیچاں دیکھئے

ہر برس معمول اپنا یہ جنوں میں ہو گیا
اس طرف آئے بہار اُس سمت زنداں دیکھئے

مری شامت جو آئی بڑھ کے قدموں پر جبیں رکھ دی
جہاں سے تیغ قاتل نے اُٹھائی تھی وہیں رکھ دی

---

**امیر مینائی** مفتی منشی امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ خلف مولوی کرم محمد۔ نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت میں ۱۸۲۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ آپ کا نسبی سلسلہ بہت ہی قریب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب نور اللہ مرقدہ سے ملتا ہے۔ جن کا مزار مقدس لکھنؤ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر کے نام نامی کے ساتھ مینائی لکھا جاتا ہے۔ آپ کو صرف خاندانی فضیلت ہی حاصل نہ تھی بلکہ اپنی ذات سے خود بھی صاحب زہد و تقویٰ، صوفی مشرب، خدا پرست، درویش صفت، منکسر المزاج آدمی تھے۔ خاندانِ چشتیہ صابریہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے اور بعد میں خرقہ خلافت سے

بھی سرفراز ہوئے تھے۔

آپ کی تعلیم دار العلوم فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی۔ فہم سلیم و ذہانت فطری کی امداد سے عربی و فارسی میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ اس کے علاوہ طب، جفر، نجوم وغیرہ میں بھی معلومات بہم پہنچائی تھی۔

جس عہد میں امیرؔ نے ہوش سنبھالا وہ عہد شاعری کا نہایت سرگرم زمانہ تھا۔ چنانچہ آپ کی طبیعت بھی شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی سید مظفر علی خاں اسیرؔ سے شرف تلمّذ حاصل کیا۔ اُستاد کے فیض، ناسخؔ کی بلند پروازی اور آتشؔ کی آتش بیانی نے اُن کی نوخیز طبیعت میں عاشقانہ رنگ پیدا کیا۔ صباؔ، وزیرؔ، رندؔ، خلیلؔ کی نغمہ سرائیوں اور انیسؔ و دبیرؔ کی معرکہ آرائیوں نے آپ کی رہنمائی کی۔ شہرت روز افزوں ترقی کرتی گئی حتیٰ کہ واجد علی شاہ اخترؔ کے دربار میں باریابی ہوئی اور حسب الحکم دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" تصنیف کر کے خلعت فاخرہ اور انعام و اکرام حاصل کیا۔

الحاق اودھ کے بعد نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے آپ کو طلب فرمایا اور عدالت دیوانی میں معزز آسامی پر مامور کیا۔ اُس وقت سے آپ کی مستقل سکونت بجائے لکھنؤ کے رامپور میں منتقل ہو گئی۔

یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں نے شعر و سخن کی جو قدردانی فرمائی اُس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ رامپور میں شعرائے باکمال کا جمگھٹا تھا۔ اور تغزل کا گلشن لہلہا رہا تھا۔ امیرؔ اس فضا میں چالیس بیالیس سال تک اپنی شاعری کا ڈنکا بجاتے رہے۔ مرزا خاں داغؔ مدت سے حیدر آباد میں

فارغ البالی سے بسر اوقات کر رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے قدر دان اور دوست حضرت امیر مینائی کو بھی وہیں طلب کیا۔ امیر کو بھی شوق تھا چنانچہ گئے لیکن وہاں پہنچتے ہی علالت نے آگھیرا۔ ایک ماہ اور نوروز بیمار رہ کر راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ سالِ وفات ۱۹۰۰ء ہے۔

امیر نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے دو کتابوں کا نام اوپر آچکا ہے۔ باقی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔ دو مثنویاں "نورِ تجلّی" اور "ابرِ کرم" اور چار مسدس "صبحِ ازل"۔ "شامِ ابد"۔ "لیلۃ القدر"۔ "ذکرِ شاہِ بینا"۔ چھ واسوخت۔ دو دیوان "مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق"۔ ان کے علاوہ امیر نے ایک لغت بھی لکھنی شروع کی تھی اور اُس کا نام "امیر اللغات" رکھا تھا۔ صرف دو جلدیں جن میں صرف الف اور بے کی تقطیع شامل ہے لکھی جاسکی تھیں کہ دستِ قضا و قدر نے اُن کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔ یہ دونوں جلدیں جس قابلیت، تحقیق و جستجو سے لکھی گئی ہیں اور جس قدر مفید ہیں، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر یہ عظیم الشان کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو زبانِ اُردو کی کیسی مہتم بالشان خدمت ہوتی۔

امیر کی شاعرانہ عظمت کا سکّہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ اُن کا ابتدائی کلام لکھنؤ اسکول کی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ وہی خشک اور کھیکی تشبیہات، وہی بےکیف استعارات، وہی ظاہری حُسن کی تعریف و توصیف وہی تصنّع اور وہی آورد، غرض اُن کا پہلا دیوان "مراۃ الغیب" اسی قسم کی شاعری سے پُر ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کہیں کہیں نزاکت اور

رنگینی سے کلام میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

دورانِ قیام رامپور میں مرزا داغؔ کے رنگ میں کہنے لگے تھے۔ دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" اسی دور کی یادگار ہے۔ اس دیوان کا خاص رنگ فصاحت اور ترنّم ہے۔ شوخی بھی ایک حد تک پائی جاتی ہے جو کہیں کہیں متانت سے دور بھی جا پڑی ہے۔ تصوّف کی ہلکی سی چاشنی بھی موجود ہے۔ لیکن غالب رنگ اِن کے کلام کا حُسن و عشق ہی ہے۔ خیالات میں عمق، جذبات میں شدّت اور احساسات میں رنگینی پائی جاتی ہے۔

امیرؔ کی زبان عام طور پر صاف اور سلیس اور بول چال اور محاورات کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

امیرؔ کو دیگر اصنافِ سخن خصوصاً قصیدہ پر بھی قدرت کامل حاصل تھی۔ نعتیہ غزلیات و قصائد بھی خوب لکھتے تھے۔ آپ کے بعض خطوط بھی شائع ہوئے ہیں جن میں لطفِ زبان کے ساتھ ساتھ طرزِ بیان نہایت دلکش اور بے ساختہ ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :—

نہ ہوگا بند جب تک نقدِ جاں باقی ہے قالب میں
سخی کے گھر کا دروازہ ہے چاک اپنے گریباں کا
جگر کو دوں کہ دل کو دوں بتا اے ناوکِ قاتل
کہ دو پیاسوں میں ہے یہ ایک قطرہ آبِ پیکاں کا

وہ زخمی ہیں تڑپ کیسی چھڑکتا گر نمک قاتل
دہانِ زخم سے ہم چوم لیتے مُنھ نمکداں کا
کہیں ضبطِ فغاں سے عشق کے آثار چھپتے ہیں
لبِ خاموش سے پیدا ہے صدمہ دردِ پنہاں کا
مگر اُڑتی ہوئی پریاں پھنسانے کا ارادہ ہے
ہوا پر جال پھیلایا ہے کیوں زلفِ پریشاں کا
ہاتھ رکھ کر مرے سینہ پہ جگر تھام لیا   تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا
تیرے بندوں سے کرتے ہیں یہ بُت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شانِ کبریائی کا
خدا نے اِن بتوں کو کچھ نئی طینت عنایت کی
خمیر اِن کا بنا ہے کھینچ کے جوہر بیوفائی کا
ایک دلِ ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا   سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا
کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر   جانے دو اک بیوفا جاتا رہا جاتا رہا

## شاگردانِ امیر مینائی لکھنوی

### ریاض خیرآبادی

منشی سیّد ریاض احمد نام۔ ریاض تخلص۔ خلف منشی سیّد طفیل احمد۔ خیرآباد کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم خیرآباد کے مدرسۂ عربیہ میں ہوئی۔ مگر ابھی فارغ التحصیل نہیں ہوئے تھے کہ شاعری کا چسکا پڑ گیا۔ پہلے اسیر سے تلمّذ اختیار کیا تھا۔ بعد میں امیر سے

اصلاح لی۔ خیرآباد سے اُردو شعر وسخن کا ایک رسالہ "گل کدۂ ریاض" نامی جاری کیا۔ کچھ مدت بعد "ریاض الاخبار" نکالا۔ لیکن لکھنؤ کی فضا پست تھی۔ چنانچہ ریاض الاخبار کے دفتر کو وہیں اُٹھالائے۔ یہ اخبار پندرہ سولہ برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے بعد آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کے سرشتہ دار ہو گئے۔

انھیں ایام میں نواب کلب علی خاں مرحوم نے اُن کی تیزیِ طبع اور خوش فکری کی شہرت سن کر رامپور طلب کیا۔ مگر آپ وہاں کچھ زیادہ قیام نہیں کرسکے۔ اخبار کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا ضمیمہ "فتنہ" و "عطرِ فتنہ" کے نام سے انھیں ایام میں نکالنے لگے۔ اُس میں چلبلے مضامین اور منتخب اشعار درج ہوتے تھے۔ گورکھپور میں پندرہ برس فارغ البالی سے گزارنے کے بعد آپ پھر لکھنؤ چلے آئے۔ راجہ محمود آباد اُن کی بہت قدر دانی کرتے تھے۔

ریاض نے سال گزشتہ ۱۹۳۵ء میں اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ فرمایا۔

ریاض کی زباندانی مسلّم ہے۔ اغلاط سے کلام پاک ہوتا ہے اور وہ ایک طرزِ خاص کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ قبولِ عام کا یہ عالم ہے کہ اِن کے جیتے جی اِن کے اکثر اشعار ضرب الامثال کے طور پر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔

مزاج میں لاابالی پن اور وارفتگی جو رندانہ مزاجی کا لازمہ ہے زیادہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کلام میں شوخی اور بے چینی حد سے زیادہ ہے۔ مگر لطف یہ کہ کہیں ابتذال اور عامیانہ پن نہیں آنے پاتا۔ زبان میں صفائی اور فصاحت

بدرجۂ کمال موجود ہے۔ سچے عشق کی تصویریں اُن کے کلام میں کم ہیں۔ معاملہ بندی، ہنسی ٹھٹھول، چلی کٹی، واعظوں پر پھبتی، رندانہ بے تکلفی کے مضامین اُن کے کلام میں بڑے دلکش پیرایہ میں ملتے ہیں۔ خمریات یعنی شراب و کباب کے مضامین جس کثرت سے ریاضؔ کے ہاں ملتے ہیں اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتے۔ اِس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تصوف اور اخلاق کے رنگ کی بھی کہیں کہیں جھلک نظر آتی ہے۔ نازک خیالی کی بھی کمی نہیں۔ اگرچہ تخیل کا میلان قدرتی طور پر رندانہ حُسن پرستی، معاملہ اور مذاق کا پہلو لئے ہوئے ہے مگر اور شعبوں میں بھی طبیعت بند نہیں۔

اب کلام سے لطف اُٹھائیے:—

پری اُڑتے میں زلفِ عنبریں معلوم ہوتی ہے
یہ کالی شکل بھی کتنی حسیں معلوم ہوتی ہے

چلی بھی تیغ تو کس ناز سے رُک رُک کے تھم تھم کر
یہ کچھ اُن سے زیادہ نازنیں معلوم ہوتی ہے

ارے ساقی ذرا میری شراب تلخ تو لانا
مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

مے چُرانے میں ہمیں ہے یدِ طولیٰ کیسا
ہم اڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

جائیے جائیے ہم حشر میں سننے کے نہیں
آیئے آیئے اب وعدۂ فردا کیسا

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید
مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا

جب یہ مل جائیں کلیجے سے لگا لے اِن کو
اِن حسینوں سے کسی بات کا شکوا کیسا

کوئی مُنھ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائیگی یوں ہی جبیں پر

پاک صاف ایسی ہے جس نے پی فرشتہ بن گیا
زاہد و یہ حور کے دامن میں ہے چھانی ہوئی

## حضرت جلیل مانکپوری

حافظ جلیل حسن نام، جلیل تخلص۔ خلف مولوی حافظ عبد الکریم، مانکپور کے رہنے والے۔ اور امیر مینائی مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں۔ بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اور عرصۂ دراز تک دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے۔ امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے اور اُن کے بعد وہیں قیام کیا۔ امیر مرحوم کی وفات کے بعد مرحوم کے بعض تلامذہ مثلاً حضرت ریاض، مضطر، وسیم وغیرہ نے آپ کو مرحوم کا جانشین قرار دیا۔ چنانچہ اب وہ اسی لقب سے مشہور ہیں۔ اکثر تلامذۂ امیر مرحوم آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ فارسی کی استعداد فاضلانہ ہے اور عروض و قوافی میں خاص دخل رکھتے ہیں۔ سلطنت آصفیہ نے بجا طور پر آپ کی قدردانی کی ہے۔ اور آپ کو "فصاحت جنگ" کا خطاب دیا ہے۔

جلیل مسلم الثبوت استاد ہیں۔ کلام کا پایہ بہت بلند ہے۔ سادگی بیان وصفائی زبان کے ساتھ ساتھ بلند پروازی اور نازک خیالی دو متضاد صفتیں آپ کے کلام میں جمع ہوئی ہیں۔ اگرچہ اکثر اشعار رعایت لفظی اور محاورہ بندی سے باہر نہیں ہوتے تاہم بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس رنگ کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔ اخلاقی اور صوفیانہ مضامین بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں لیکن یہ اُن کا خاص رنگ نہیں۔ خاص رنگ حُسن وعشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے۔ لیکن اس رنگ میں بلاغت، متانت، خوش مذاقی اور بلند خیالی کو نہیں چھوڑتے۔ زبان کی سلاست اور روزمرّہ کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ ہر خاص و عام آپ کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام

ملاحظہ ہو:۔

جب ترے عشق کا پھندہ مری گردن میں رہا — پھر برابر ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
لوگ آرام کی خاطر رہے دنیا میں خراب — اور آرام چھپا گوشۂ مدفن میں رہا
چاک دامانیٔ یوسف تو کوئی بات نہ تھی — ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا

رات دل سے مرے اس درد کے نالے نکلے — گھر سے اپنے وہ کلیجے کو سنبھالے نکلے
پھر سرِ چرخ دھواں دھار گھٹائیں آئیں — پھر ہوا کھانے حسین گیسوؤں والے نکلے
ناز و انداز نے تنہا انھیں چلنے نہ دیا — ساتھ سب گوشۂ دامن کو سنبھالے نکلے

## جلال لکھنوی

حکیم سید ضامن نام۔ جلال تخلّص۔ خلف حکیم اصغر علی۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ سادات عظّام میں سے تھے۔ خاندان میں کئی پشت سے طبابت کا سلسلہ جاری تھا۔ جلال کے والد اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے۔

جلال ۱۸۳۴ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ نواب آصف الدولہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ لیکن کتب درسیہ کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ شعر و سخن کا شوق دامنگیر ہوا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلال شاگرد رشک کو اپنا کلام دکھایا۔ کچھ عرصے کے بعد ہلال نے خود انھیں اپنے اُستاد رشک کا شاگرد کرا دیا۔ جب رشک سفر عراق کے لئے روانہ ہوئے تو جلال برق سے مشورہ کرنے لگے۔

جلال ہمیشہ فنا فی الشعر رہے اور قلیل مدت میں کامل شہرت حاصل کر لی۔

جب اِن کا شہرہ رامپور پہنچا تو نواب کلب علی خاں نے انھیں طلب کیا۔ یہ وہاں پہنچے مگر نواب صاحب کی عمر نے وفا نہ کی اور دو ماہ بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ نواب کلب علی خاں کی قدردانی و سخن فہمی کے سایہ میں جلال فارغ البالی سے رامپور میں قیام پذیر رہے۔ امیر مینائی، داغ اور جلال میں اکثر صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اور ہم طرح غزلیں پڑھ کر اپنے اپنے رنگ کی داد لیتے تھے۔ اِن تینوں اساتذہ میں کمال اتحاد اور یگانگت تھی۔ داغ کو رامپور چھوڑنے کے بعد اُن کی جدائی کا کمال افسوس تھا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سید جلال سے

نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ریاست مانگرول کاٹھیاواڑ کے قدردان رئیس کے اصرار پر جلال کئی برس وہاں بھی قیام پذیر رہے۔ آخر عمر میں لکھنؤ آ رہے تھے اور وہیں بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء آپ نے انتقال فرمایا۔

جلال نے چار دیوان یادگار چھوڑے۔ (۱) "شہیدِ شوخ طبع" (۲) "کرشمہ جاتِ سخن" (۳) "مضمون ہائے دلخوش" (۴) "نظمِ نگارین"۔ اِس کے علاوہ کئی رسالے، لغت و عروض وغیرہ پر آپ نے تصنیف فرمائے تھے۔

جلال کے مسلّم الثبوت اُستاد ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ علمی قابلیت کے علاوہ آپ کو فنِ سخن میں محققانہ اور مجتہدانہ مرتبہ حاصل تھا۔ اور تمام اصنافِ سخن پر قدرتِ کامل رکھتے تھے۔ ناسخ مرحوم کے خاندانِ شاعری کے آخری یادگار اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کے آخری نمایندے تھے۔

جلال کا کلام گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہے۔ کہیں تشبیہ ہے کہیں

خیال گوئی۔ کسی جگہ عاشقانہ رنگ ہے۔ کہیں محض معاملہ بندی۔ لیکن ہر زبان کی صحت اور قواعد کی پابندی کا اس حد تک خیال رکھا گیا ہے کہ عام طور پر ان کا کلام پھیکا اور بے نمک ہو گیا ہے۔ اگرچہ لوازمات حُسن کی تعریف و توصیف سے اِن کا کلام اکثر پاک ہے۔ تاہم علوئے خیال اور صداقتِ جذبات کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔ کلام کا بڑا حصہ پست اور عامیانہ ہے۔ شاعرانہ حیثیت سے جلالؔ کو امیرؔ مینائی اور داغؔ کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا لیکن زبان و محاورات کے صحیح استعمال اور قواعد کی پابندی سے جو خدمات زبان کی آپ نے کی ہیں۔ اُن کا تقاضا ہے کہ آپ کو اس دور میں نمایاں جگہ دی جائے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

آرزو ہے کہ بُلا کر اُسے دل میں رکھئے ۔۔۔ صاحبِ خانہ جو بن جاتا ہے مہماں ہو کر
نزع میں اس لئے کھولے ہوئے بال آئیں وہ ۔۔۔ روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہو کر
قتلِ عالم کو کیا پھر وہ نہ ٹھہرے قاتل ۔۔۔ بھولے بن کر کہیں چھوٹے کہیں ناداں ہو کر

کلیجہ کوئی تھام کر رہ گیا ہے ۔۔۔ اُدھر جانے والے اِدھر دیکھ لینا
فلک ترتے ہونگے جیالوں کی صورت ۔۔۔ دکھائے گی جو چشمِ تر دیکھ لینا
تماشا مری بیقراری کا آکر ۔۔۔ شبِ وعدہ تم رات بھر دیکھ لینا

---

**آرزو لکھنوی**

سید انور حسین نام۔ آرزو تخلص۔ خلف میر ذاکر حسین ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ عربی و فارسی مشہور علماء سے پڑھی۔ بارہ برس

کی عمر سے شعر وسخن کا شوق ہوا۔حکیم ضامن علی جلاؔل لکھنوی سے علم عروض حاصل کیا اور اُنھیں سے اصلاح سخن لینے لگے۔ پہلے اُمیدؔ تخلّص اختیار کیا تھا بعد میں آرزوؔ ہوگئے۔ اُستاد کی توجہ، ذاتی قابلیت اور کثرتِ مشق سے تھوڑے عرصے میں اُستادی کا مرتبہ حاصل کر لیا۔فی الحال آپ اپنے وطن لکھنؤ میں اقامت گزیں ہیں۔ مقامی اور بیرونجات مثلاً الہ آباد کانپور وغیرہ مقامات کے مشاعروں میں رونق افروز ہوتے ہیں۔

آرزوؔ، جلاؔل لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ اور لکھنؤ اسکول کی اُس شاعری کی یادگار ہیں جس پر رامپور کے زمانے میں دہلی اسکول کی شاعری کا اثر پڑ چکا تھا۔ آپ کو جملہ اصنافِ سخن پر قدرت کامل حاصل ہے۔لیکن آپ کی شاعرانہ جدوجہد کا خاص میدان غزل ہے۔ زبان صاف وشستہ ہے۔ہندی الفاظ اور فقرے نہایت لطف سے استعمال ہوئے ہیں۔ محاورات اور ضرب الامثال کو بھی التزاماً نظم کرتے ہیں۔لیکن کمال یہ ہے کہ بر جستگی قائم رہتی ہے۔رعایت لفظی جو لکھنؤ اسکول کی امتیازی خصوصیت ہے، آپ کے کلام میں موجود ہے۔کہیں کہیں تصنّع اور آورد کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔غزلیات میں عام طور پر ایک دردانگیز یاس پائی جاتی ہے جو غالباً میرؔ کی تقلید کا اثر ہے۔شوخی۔ادابندی اور نوک جھوک کا عنصر بھی موجود ہے لیکن متانت اور سنجیدگی کے قوانین کی خلاف ورزی کہیں نہیں پائی جاتی۔

آرزوؔ صاحب نے حال ہی میں غزل کے لئے ایک خاص زبان ایجاد کی ہے اور اُس کا نام خالص اُردو رکھا ہے۔ اُس میں عربی و فارسی الفاظ اور

تراکیب کا دخل نہیں تاہم فصاحت سے گرنے نہیں پاتی۔ ظاہر ہے کہ اس خالص اُردو کا میدان کسی قدر تنگ ہوگا اگرچہ یہ زبان عام فہم ہے ہندی داں حضرات بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زبان کچھ مفید بھی ثابت ہو سکتی ہے اور سوائے غزل کے چند اشعار کے کچھ اور کام بھی اس سے لیا جا سکتا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

جانچ کر تابِ نظر کو روئے جاناں دیکھئے ۔۔۔ دیکھ سکئے کوندتی بجلی تو ہاں ہاں دیکھئے
چوٹ دل پر کھا کے حالِ کاہشِ جاں دیکھئے ۔۔۔ کیجئے پیدا نظر پھر دردِ پنہاں دیکھئے
جان کی راحت سے بڑھ کر دو گرہ کپڑا نہیں ۔۔۔ دیکھئے اب دل کی اُلجھن یا گریباں دیکھئے

آپ مٹ جائیں ہم مگر دل سے ۔۔۔ داغِ الفت نہیں مٹانے کے
جیسے ہم صورت آشنا ہی نہیں ۔۔۔ صدقے اس مُنھ چھپا کے جانے کے

## خالص اُردو

رس اُن آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی ۔۔۔ سیکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اِتنا پانی
چاہ میں پاؤں کہاں آس کا میٹھا پانی ۔۔۔ پیاس بھڑکی ہوئی ہے اور نہیں ملتا پانی
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی ۔۔۔ جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
ہاتھ جل جائیگا چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ ۔۔۔ آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی
رس ہی رس جن میں ہے پھر سیل ذرا سی بھی نہیں ۔۔۔ مانگتا ہے کہیں اِن آنکھوں کا مارا پانی

**تسلیم**

منشی احمد حسین نام عرف امیر اللہ۔ تسلیم تخلّص خلف مولوی عبد الصمد فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ مگر مدّتوں لکھنؤ رہے۔ اس وجہ سے لکھنوی مشہور ہیں۔ تسلیم ۱۸۲۰ء میں موضع منگلیسی نواح فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مع اہل وعیال لکھنؤ آرہے تھے اور وہیں نواب محمد علی شاہ کے فوجی دفتر میں ملازم ہوگئے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد تسلیم اُن کی جگہ ۳۰ روپیہ مشاہرہ پر ملازم ہوئے۔

تسلیم کو عربی و فارسی میں کامل دستگاہ تھی۔ خوشنویسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ شاہی ملازمت کے بعد آپ نولکشور پریس میں بحیثیت کاتب ۲۰ روپیہ مشاہرہ پر ملازم ہوگئے تھے۔ شاعری میں آپ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور اُن سے اِس قدر عقیدت و ارادت تھی کہ اُن کے رنگ شاعری اور اپنی شاگردی کو فخر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی  مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

غدر کے بعد آپ رامپور پہنچے اور ۳۰ روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم ہوگئے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد آپ ٹونک پہنچے اور وہاں سے منگرول۔ مگر کہیں قسمت نے یاوری نہیں کی۔ آخر نواب حامد علی خاں نے پھر انھیں رامپور طلب کیا اور ۴۰ روپیہ وظیفہ مقرر کردیا۔ آخر اسی طرح عُسرت اور تنگی کی زندگی بسر کرکے اور ضعیفی کے شدائد برداشت کرکے ۱۹۱۱ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

تسلیم کے تین دیوان شائع ہوچکے ہیں:۔ (۱) نظم ارجمند (۲) نظم دل افروز

(۳) دفترِ خیال۔

دیوانوں کے علاوہ آپ نے آٹھ مثنویاں بھی لکھی ہیں :۔ نالۂ تسلیم ۔ شامِ غریباں ۔ صبحِ خنداں ۔ دل و جاں ۔ نغمۂ بلبل ۔ شوکتِ شاہجہانی ۔ گوہرِ انتخاب ۔ تاریخِ رامپور ۔

تسلیم کی غزلیات کا خاص جوہر فصاحت ، صفائی ، سادگی اور شوخی ہے ۔ جذبات میں صداقت اور جوش پایا جاتا ہے ۔ مثنوی میں تسلیم کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ روانی اور صفائی کے ساتھ جذبات کی رنگینی عجب بہار دکھاتی ہے ۔ بطور نمونہ چند اشعار غزلیات کے ملاحظہ ہوں ۔

خاک ہونے سے خاک ہاتھ آیا جب میں تیرا ہی نقشِ پا نہ ہوا
ہم نے کعبہ میں بھی نہ سجدہ کیا جس جگہ تیرا نقشِ پا نہ ہوا
برسوں لبیک خواں رہا تسلیم ق حج کعبہ کبھی قضا نہ ہوا
پیر خدا جانے بت پرستی میں کیا مزا تھا کہ پارسا نہ ہوا

---

قیامت کی ہے بینائی سرشکِ چشمِ گریاں میں
کبھی پہلوئے مژگاں میں کبھی آغوشِ داماں میں

ہوا ہیں زندۂ جاوید ہو کر قتل اے قاتل
بجھی تھی کیا تری شمشیر موجِ آبِ حیواں میں

تہِ مدفن کھلی آنکھیں تو اس دنیا کو یہ سمجھے
نظر آتی تھیں کچھ شکلیں ہمیں خوابِ پریشاں میں

ڈراتا کیوں ہے اے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احساں میں

---

## حسرت موہانی

عام طور پر حسرت موہانی کو موجودہ دور کا شاعر کہا جاتا ہے اور غالباً یہ محض اس لئے کہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ اب تک حیات ہیں۔ خدا آپ کی عمر میں برکت دے۔ یہ مانا کہ حسرت اپنی عمر اور سیاسی خیالات کے لحاظ سے موجودہ عہد کے نامور اور معزز شخص ہیں لیکن ہمیں محض اِن کی شاعری سے سروکار ہے۔ اور اِن کی شاعری زبانِ حال سے کہتی ہے کہ مجھے موجودہ دور سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے دیکھو تو دورِ پنجم کی عینک سے دیکھو۔ خاکسار نے حسرت کے کلام کا بغور مطالعہ کیا۔ چند اشعار جن میں سیاسی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے انھیں چھوڑ کر باقی تمام کلام کا تقاضا ہے کہ حسرت موہانی کو اس دور میں جگہ دی جائے جس دور میں اُن کے استاد حضرت تسلیم رونق افروز ہیں۔ بہرحال زمانہ کچھ بھی کہے ناچیز کی یہی رائے ہے۔

حسرت تخلص ہے مولانا سید فضل الحسن صاحب کا۔ آپ ۱۸۷۵ء میں بمقام موہان (ضلع اناؤ) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر علی گڑھ پہنچ کر بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اِسی فضا میں آپ کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ شاعری کا شوق ابتدا سے ہے۔ حضرت تسلیم سے تلمذ حاصل تھا۔ مدتوں تک آپ کا رجحان علمی و ادبی خدمات کی طرف رہا۔ مگر جب سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں، اِس طرف پوری توجہ نہیں رہی۔ فی الحال کانپور میں مستقل

قیام ہے۔ اور سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی مصروفیت بھی جاری ہے۔

حسرت کا سلسلۂ شاعری مومن دہلوی سے ملتا ہے۔ اس لئے حسرت میں وہ تمام خوبیاں ملتی ہیں جو دہلی اسکول کی شاعری سے مخصوص ہیں۔ خود فرماتے ہیں سہ

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

آپ کا شمار اساتذہ میں ہے۔ آپ قدماء کی تقلید کا دم بھرتے ہیں۔ اور انھیں راستوں پر چل کر فخر کرتے ہیں۔

حسرت کی زبان وہی ہے جو اُن کے اُستاد اور دادا اُستاد کی۔ جس کی خصوصیات روانی، بے تکلفی، شستگی اور بانکپن ہیں۔ مومن کی طرح آپ کو نازک اور معنی خیز فارسی تراکیب کا خاص شوق ہے۔ اور اُن کو اس برجستگی سے استعمال کرتے ہیں کہ شعر میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

عام طور پر جیتا جاگتا حُسن اور مجازی عشق آپ کی شاعری کی روح رواں ہے۔ حُسن میں دلکشی، ناز و انداز، غنج و دلال، نخوت و بے نیازی، شوخی اور لگاوٹ ہے۔ عشق میں والہانہ شیفتگی، دیوانگی، جوش، اور شدید جذبات ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعر سرتاپا اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اشعار میں سادگی، جوش، اصلیت، نزاکت اور بانکپن کے امتزاج سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے تڑپ کہئے یا تاثیر یا شاعرانہ انبساط کہہ کر اس کے مفہوم کو ادا کیجئے۔ حسرت کے کلام میں کہیں کہیں روحانیت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ مسلسل غزلیات بھی دواوین میں موجود ہیں۔

عام طور پر زمین کا انتخاب لاجواب ہے۔ نئی نئی زمینیں اور چھوٹی چھوٹی بحریں اور اُن میں روانی اور شگفتگی خاص حسرت کا حصّہ ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا
سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں — دردِ دل اُس نے تو حسرت اور دونا کر دیا
قاموں پہ اُن کے رکھ کے سر رفعِ ملال کر دیا — ہمّت عذر خواہ نے آج کمال کر دیا
دُوہام اُن کی بزم سے جیتے رہے تو کیا ہے — آہ وہ زندگی جسے غم نے وبال کر دیا
وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں — آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو — ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
التفاتِ یار تھا اِک خوابِ آغازِ وفا — سچ ہوا کرتی ہیں اِن خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ عشّاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

## تبصرہ

**زبان** اصلاحِ زبان کے لیے دَورِ چہارم خاص طور پر ممتاز نظر آتا ہے لیکن دَورِ پنجم بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ دورِ چہارم کی بچی کھچی ناہمواریاں دورِ پنجم میں ہموار ہوئیں۔ "آئے ہے" "جائے ہے" وغیرہ ذوق و غالب کے ہاں بلکہ داغ کے ابتدائی کلام میں بھی موجود ہے لیکن دَورِ پنجم کا آخری زمانہ اِس قسم کے قدیم روزمرّہ و محاورات سے قطعی پاک نظر آتا ہے۔

اس دَور کی سب سے زیادہ اور نمایاں خصوصیت صفائی، سادگی اور اور بے تکلفی ہے۔ امیر مینائی، جلال، تسلیم۔ اگرچہ لکھنؤ کے شاعر ہیں، لیکن ان کی زبان میں بھی روانی، سلاست اور بے تکلفی کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے۔

**اصنافِ سخن** | اس دَور کا بڑا کارنامہ غزل ہے۔ یوں تو اس دَور میں قصیدہ بھی ہوا اور مثنوی بھی۔ لیکن غزل سب پر بھاری ہے۔

**موضوعِ سخن** | بازاری حُسن و حُسن فروشی اور عشق و بوالہوسی اس دَور کا موضوعِ سخن ہے۔ بلند قسم کے عشق کی تصویریں اس دَور میں کم ملتی ہیں بلکہ برخلاف اس کے اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جن کو بد اخلاقی کا محرّک کہنا نازیبا نہیں۔ اس دَور کی شاعری روحانی جذبات کو ترقی نہیں دیتی۔ معاملہ بندی، حُسن و عشق کی عریاں تصویریں، ہنسی ٹھٹھول، نوک جھوک، رندانہ بے تکلفی، واعظوں پر پھبتی، رقیبوں کی کمبختی، غرض اس محدود دائرے سے شعرا نے کسی مقام پر باہر قدم نہیں رکھا۔

**اسلوبِ بیان** | بے تکلفی اس دَور کا خاص اسلوب ہے۔ اگرچہ امیر اور جلال کے ابتدائی کلام میں تکلف اور آورد کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن آخر زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ بھی صفائی اور بے تکلفی کی طرف رجوع ہو گئے تھے۔ خوشنما اور پُرمعنی فارسی تراکیب بھی اس دَور میں میں نظر آتی ہیں اور یہ خاص حسرت موہانی کا حصّہ ہے۔

---

# باب ۱۰

## دورِ جدید

**تمہید** گذشتہ ادوار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ چند مثنویوں، مرثیوں اور نظیر اکبر آبادی کے کلام کو چھوڑ کر اب تک اُردو ادب کا کارنامہ غزل ہی تھا۔ ہر دور میں اسی صنف کا پلّہ بھاری رہا ہے۔ اِس صنف کو میر۔ مومن۔ غالب جیسے شاعروں نے آسمان تک پہنچا دیا۔ اور دیگر اساتذہ اور خوش فکر شعراء نے غزل کو اس اِس انداز سے کہا کہ متاخرین کے لئے بجز اس کے کہ انھیں راستوں پر چلیں اور اُگلے ہوئے نوالے چبائیں اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ اوّل تو غزل کا میدان ویسے ہی تنگ، اِنے گنے شعر، ان میں بھی ردیف و قافیہ کی قید۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حُسن و عشق کا محدود دائرہ۔ آخر کہاں سے اتنی گنجائش آئے کہ شعراء اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کی ترجمانی خاطر خواہ کر سکیں۔

تیسرے دور میں نظیر اکبر آبادی مجتہدانہ انداز سے اُٹھتے ہیں اور غزل کو چھوڑ کر اپنا راستہ الگ نکالتے ہیں۔ ان کے کلام میں تنوع ہے۔ گوناگوں مضامین سے شاعری کے میدان کو وسعت دیتے ہیں مگر ان کا رنگ مقبول نہیں ہوتا۔ اوّل تو وہ اُستاد بن کر اپنے شاگردوں کے ذریعہ پروپگنڈا نہیں کرتے۔ دوسرے نئی چیز کے لئے زبان و قواعد کی قیود کو توڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ

ہوتا ہے کہ لوگ باگ اُن کے رنگ سے متنفر ہو جاتے ہیں۔

چوتھے دور میں مرثیہ نگاری کو فروغ ہوتا ہے۔ جذبات و فطرت اور منظر نگاری، کردار نویسی، موسمی اور مقامی کیفیات، رزمیہ نمونے، غرض کیا ہے جو اُن مرثیوں میں نہیں۔ انھیں اگر اُردو ادب کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہیں۔ لیکن افسوس کہ یہ صنفِ شاعری محض مذہبی بن کر رہ گئی۔ بجز ایک خاص طبقۂ شعراء کے اور کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے علاوہ چونکہ مراثی کی بنیاد خاص معتقدات پر ہے۔ اس لئے یہ عام طور پر مفید ثابت نہ ہو سکے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی فضا ہر حیثیت سے بدل جاتی ہے۔ حکومت ایسی قوم کے ہاتھ میں جاتی ہے جس کو ہندوستانیوں اور ہندوستانیوں کے علم و ادب سے قطعی دلچسپی نہیں۔ اُردو شاعری کا مایۂ ناز جوہر روحانیت' اس قوم کی روح رواں مادّہ پرستی۔ ایسی حالت میں انھیں اُردو غزل کی کیا خاک قدر ہو سکتی تھی بلکہ یوں کہئے کہ نو وارد اِسے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ محکوم قوم کی شاعری حاکموں کو کیا پسند آتی۔

انگریز اپنے ہمراہ اپنا لٹریچر لے کر آئے تھے۔ اِن کی نثر، نظم، ڈراما، اصل یا ترجمہ ہو کر ملک میں پھیلا۔ اِس نئی چیز نے لوگوں کے دلوں میں اُمنگ پیدا کی۔ اپنا ادب اِن چیزوں سے خالی پایا۔ شوق پیدا ہوا کہ اپنے ادب کو بھی اِن گلہائے رنگا رنگ سے باغ و بہار کیجئے۔ چنانچہ ایک جماعت ایسے شعراء کی پیدا ہو گئی جنھوں نے انگریزی لٹریچر سے متاثر ہو کر اُردو میں طرح طرح کی راہیں نکالیں۔ اگرچہ یہ شعراء اس سے قبل خود پایہ کے غزل گو تھے۔ لیکن انگریزی اثر سے

انھیں غزل بے مزہ معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ انھوں نے غزل کو چھوڑ کر خیالات کے تسلسل کے لئے مثنوی کو لیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ایک گراں قدر ذخیرہ اُردو ادب میں مہیا کر دیا بلکہ اُردو شعر و سخن کی فضا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

جو شعراء انگریزی لٹریچر سے متاثر ہوئے اور جنھوں نے اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا اُن میں آزاد اور حالی سب کے پیش رو ہیں۔ ان کے بعد اسماعیل۔ سرور جہان آبادی۔ اقبال و چکبست کا نمبر آتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کا شمار بھی اُن ہی مصلحین ادب میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اِس باب میں اِن ہی حضرات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

**آزاد دہلوی**

محمد حسین نام۔ آزاد تخلّص خلف مولوی محمد باقر خاص دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ذوق کے دلی دوست تھے۔ چنانچہ انھوں نے آزاد کو اُن کے حوالہ کیا۔ آزاد نے انھیں کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم پائی اور نکات عروض و فنِ سخن حاصل کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اور اس درسگاہ سے علوم مروّجہ تحصیل کئے۔

شاعری کا چسکا ابتدا سے تھا۔ اس پر ذوق سا اُستاد نصیب ہوا۔ اُن کے ہمراہ آپ کو اکثر معرکے کے مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد شعر و سخن سے کامل مناسبت پیدا ہو گئی۔

ہنگامۂ غدر میں مولوی محمد باقر صاحب شہید ہوئے۔ گھر بار لٹ گیا۔

اُستادِ ذوق کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اُن کے کلام کو آزاد چھاتی سے لگائے بیٹھے تھے۔ افسوس کہ اسی ہنگامہ میں وہ بھی غارت ہو گیا۔ جب دہلی میں کوئی یار و مددگار نہ رہا تو بہ تلاشِ روزگار لاہور پہنچے۔ اور وہاں سررشتۂ تعلیم میں ۱۵ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ لیکن اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت روزبروز ترقی کرتے رہے اور "اتالیق پنجاب" کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے۔ سررشتۂ تعلیم نے آپ سے "قصص الہند" اور مختلف ریڈریں لکھوائیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ ہی کے ایما سے آپ نے کابل اور بخارا کا بھی سفر کیا۔ آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔

آزاد فارسی کے عالم متبحر اور عربی کے اچھے عالم تھے۔ بھاشا اور ہندی کے نکات اور خوبیوں سے پورے آگاہ اور انگریزی لٹریچر کی خصوصیات سے واقف تھے۔ فارسی ایسی سلیس اور بامحاورہ بولتے تھے اور لب و لہجہ ایسا تھا کہ اُن میں اور اہل ایران میں تمیز کرنا غیر ممکن تھا۔

آزاد جب لاہور پہنچے تو اُس وقت دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی شاعری کی کساد بازاری ہو چکی تھی۔ علوم مغربی لوگوں کے پیش نظر تھے۔ انھیں اپنی شاعری، حُسن و عشق کے جھوٹے افسانوں اور مبالغہ آمیز کیفیتوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ چنانچہ ان حالات سے متاثر ہو کر آزاد نے اُردو میں ایک نئے طرز یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اور لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی ایما سے ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ قائم کیا جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اور جس میں بجائے مصرعہ طرح کے



شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ آپ نے پہلے کئی نظمیں خود لکھیں۔ اور کئی مضامین اس ایجاد کی حمایت میں لکھے۔

اُردو نثر و نظم پر جو احسانات حضرت آزادؔ نے کئے وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے۔ اِن احسانات اور ادبی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے آپ کو ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا۔

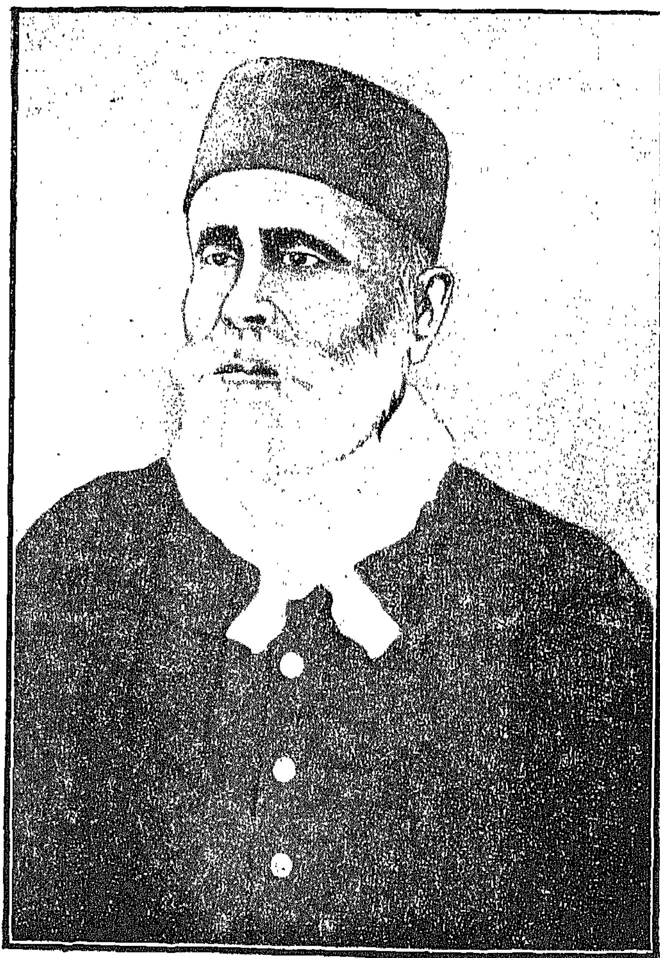
آخری عمر میں حضرت آزادؔ کی صحت جواب دے چکی تھی۔ کچھ تو دماغی مصروفیت، کچھ صاحبزادی کے انتقال کا صدمہ۔ غرض ۱۸۸۹ء میں جنون کے آثار پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہوگیا اور آخر دم تک اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر اِسی حالت میں ۲۲ر جنوری ۱۹۱۰ء کو قیدِ ہستی سے آزاد ہوگئے۔

نثر میں جو کارنامے آپ کی یادگار ہیں اُن کا تذکرہ آیندہ آتا ہے۔ یہاں آپ کی شاعری سے سروکار ہے۔ سطورِ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آزادؔ نے ذوقؔ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ انھیں کی فیضِ صحبت سے آپ نے غزل سرائی میں شہرت حاصل کی۔ لیکن افسوس کہ ان کا قدیم کلام دستبردِ زمانہ اور کچھ آپ کی بے نیازی کی بدولت ضائع ہوگیا۔ "نظمِ آزاد" میں کچھ غزلیں آپ کی موجود ہیں جن میں سے زیادہ تر علالت کی حالت میں لکھی گئی تھیں۔ عالمِ جنون میں آپ کا شغل الٰہیات تھا۔ اِسی کا ذکر اذکار آپ کی زبان پر رہتا تھا۔ چنانچہ ان غزلوں میں بھی تصوّف و حقیقت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ لیکن شاعری میں آزادؔ کی اہمیت اِن غزلوں کی بنا پر نہیں بلکہ اِن کی جدید نظموں کی بنا پر ہے۔

آپ اُردو میں نیچرل شاعری کے بانی ہیں۔ چونکہ حضرت آزاد سے پیشتر اس قسم کی شاعری کے نمونے موجود نہیں تھے۔ اس لئے ان نظموں میں شاعری کی تمام خوبیاں پیدا نہیں ہوسکیں۔ اکثر مقامات پر بندش چُست نہیں ہے اور بعض مقامات پر تعقید کا عیب بھی موجود ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کے منظوم کلام میں جوش، صداقت اور سادگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ لطیف و نازک تشبیہات و استعارات آپ کی زبان کے جوہر ہیں شگفتگی، لطافت اور ترنم آپ کے طرزِ بیان کی خوبیاں ہیں۔

آپ نے متعدد مثنویاں تصنیف فرمائی ہیں جن میں شب قدر، صبح اُمید، گنج قناعت، دادِ انصاف اور خوابِ امن بہت بلند پایہ ہیں۔

**حالی** شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین نام۔ حالی تخلص۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ وہاں سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ آباد چلی آتی ہے۔ خواجہ صاحب کو اسی قوم سے تعلق تھا۔ جب آپ نو برس کے ہوئے تو آپ کے والد خواجہ ایزد بخش نے انتقال کیا۔ چنانچہ آپ اپنے بہن بھائیوں کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پانے لگے۔ اوّل آپ نے قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد ایک بزرگ سید جعفر علی سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ ابھی تعلیم مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ آپ کی شادی کر دی گئی۔ اُس وقت آپ کی عمر سترہ سال کی تھی۔ گھر کا سب بوجھ آپ کے بھائی پر تھا۔ اس لئے سب کی یہ خواہش ہوئی کہ آپ کو نوکری تلاش کرنی چاہئے۔



مولانا الطاف حسين حالي پاني پتي

مگر آپ کو تعلیم کا شوق تھا۔ اس لئے آپ گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی چلے آئے۔ اور یہاں آپ نے عربی پڑھنی شروع کی۔ ابھی کتب متداولہ پر پوری طرح عبور نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۵۵ء میں پانی پت جانا پڑا۔ وہاں بطور خود بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔

۱۸۵۶ء میں آپ کو ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن ہنگامۂ غدر میں ملازمت چھوڑ کر آپ وطن چلے آئے اور چار برس بیکاری کی حالت میں گزارے۔ لیکن اس بیکاری کے زمانے میں اکتساب علم کا سلسلہ جاری رہا۔

قیام دہلی کے دوران میں آپ کی رسائی مرزا غالب تک ہو گئی تھی۔ چنانچہ اُن کی صحبت میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا اور اُن کی ہمت افزائی سے آپ شعر کہنے لگے تھے۔ غدر کے بعد ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے شناسائی ہوئی۔ چنانچہ آپ آٹھ برس تک بطور مصاحب اُن کے ہمراہ رہے۔ شیفتہ فارسی اور اُردو کے اچھے شاعر تھے مگر شاعرانہ جوش و خروش کچھ سرد ہو چلا تھا۔ خواجہ صاحب کی موجودگی سے اُن کا افسردہ شوق تازہ ہو گیا۔ اِدھر خواجہ صاحب کا میلان طبعی بھی چمک اُٹھا۔ اگرچہ آپ غالب سے مشورہ کیا کرتے تھے لیکن درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے آپ کو چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ جو کچھ فائدہ ہوا وہ شیفتہ کی صحبت سے ہوا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی آپ کو مل گئی۔ جس میں آپ کو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے

اُردو میں ہوتے تھے۔ اُن کی عبارت آپ درست کر دیتے تھے۔ تقریباً چار برس آپ نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ جس زمانے میں آزاد نے لاہور میں ایک نئے طرز کے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی اُسی زمانہ میں حالی نے چار مثنویاں ایک "برسات" پر، دوسری "اُمید" پر، تیسری "رحم و انصاف" پر، اور چوتھی "حب وطن" پر لکھیں۔

چار برس لاہور میں رہ کر آپ واپس دہلی آئے اور "اینگلو عربک اسکول" میں مدرس مقرر ہوئے۔ قیام دہلی کے دوران میں سر سید سے ملاقات ہوئی، اور انھیں کے ایما سے آپ نے مشہور و معروف مسدس "مد و جزر اسلام" تصنیف کیا۔ ۱۸۸۶ء میں آسماں جاہ مدار المہام حیدر آباد علی گڑھ آئے۔ سر سید نے آپ کا تعارف اُن سے کرایا۔ نواب صاحب نے از رہ قدردانی ۷۵ روپیہ ماہوار آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ ایک مرتبہ علی گڑھ کالج کا ایک وفد لے کر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کا وظیفہ ۷۵ روپیہ سے ایک سو روپیہ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں ادبی خدمات اور علم و فضل کے صلے میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب سرکار انگریزی سے ملا۔ حیدر آباد سے وظیفہ مقرر ہونے کے بعد آپ نے ملازمت ترک کر دی تھی۔ چنانچہ عمر کے آخری سال پانی پت میں بسر ہوئے۔ جہاں آپ ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر ۱۹۱۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا حالی نے نظم و نثر میں متعدد بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ تصانیف نثر کا ذکر آیندہ ہوگا۔ یہاں صرف آپ کی منظوم تصانیف سے سروکار ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے آپ بلند پایہ غزل گو ہیں اور ایک دیوان مطبوعہ آپ کی یادگار ہے۔ غزل میں غالب کی اصلاح اور شیفتہ کی ہمنشینی نے بڑی بڑی خوبیاں پیدا کردی ہیں۔ آپ کے جذبات میں شدّت ہے۔ الغرض سادگی اور لطیف کنایہ کے ساتھ اس طرح کہتے ہیں کہ اثر کی انتہا نہیں رہتی۔ مثلاً ؂

جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے     گر آج نہ تم آتے کیا جانئے کیا ہوتا

رموز عشق و محبت کو اس صفائی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل پر ایک کیف اثر چھا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور سہل ممتنع اور پُر کیف ترنّم آپ کی غزلیات کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

جدید رنگ کی نظموں میں چار مثنویاں "برسات" پر، "امید" پر، "رحم و انصاف" پر، "حب وطن" پر اور "مسدّس حالی" (مدوجزر اسلام)، شکوۂ ہند وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ اِن کے علاوہ چھوٹی چھوٹی متعدد نظمیں "مجموعہ نظم حالی" میں شامل ہیں۔

اِن جدید نظموں کا خاص جوہر سادگی، روانی، تسلسل، ہمواری اور یک رنگی ہے۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ قومیت، جذبۂ ہمدردی، اخلاق وغیرہ کے نہایت دلکش نمونے اِن نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ نظمیں خشک اور بے کیف ہو گئی ہیں۔ لیکن عام طور پر ان میں اعلیٰ شاعری کی وجدانی کیفیات موجود ہیں۔

انگریزی لٹریچر سے متاثر ہو کر مولانا نے جو غزلیات لکھیں اُن کا مرتبہ کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔ سب سے زیادہ خامی جو ان غزلوں میں محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں غزل کا فطری لب ولہجہ قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اس کے علاوہ سلاست وشگفتگی بھی قائم نہیں رہ سکی ہے۔ بہرحال جدید رنگ کا ابتدائی نمونہ ہونے کی حیثیت سے یہ غزلیں اہمیت رکھتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

نہ عیشِ کے خسروی رہے گی نہ صولت بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دئے کی کچھ روشنی رہے گی

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
جو ڈال ڈالو گے حُسنِ ظن کا تو تم سے یاں بدظنی رہے گی

بگاڑ مذہب سے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اُتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت اُن کی غنی رہے گی



مولوی محمد اسمعیل میرٹھی

**اسمٰعیل** مولوی محمد اسمٰعیل ۱۲ ر نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ کچھ مدّت بعد فارسی کے ہیڈ مولوی مقرّر ہو گئے۔ اور سہارنپور اور میرٹھ اسکولوں میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں منتقل ہوئے جہاں بارہ سال رہنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں بحسن و خوبی پنشن لی۔ اور میرٹھ واپس چلے آئے۔ حُسنِ خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے خاں صاحب کا خطاب عطا فرمایا۔ آپ پنشن لینے کے بعد اپنے وطن میں ادبی خدمات انجام دیتے رہے تا آنکہ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو پیک اجل آ پہنچا اور آپ اُس کے ہمراہ راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

آزاد کی طرح مولانا اسمٰعیل نے بھی بچّوں کے لئے چھوٹی چھوٹی ریڈریں تصنیف کیں۔ جنھیں گورنمنٹ نے منظور کیا۔ یہ ریڈریں مدّت تک مدرسوں میں جاری رہیں۔ اور اب بھی کہیں کہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ ریڈریں نہایت سلیس اور با محاورہ اُردو میں لکھی گئی تھیں اور بچّوں کے ذہنی رُجحانات اور دلچسپی کو مدّنظر رکھ کر لکھی گئی تھیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ بہت مقبول ہوئیں۔ اُن میں جو نظمیں تھیں وہ بھی مولانا ہی کی تصنیف کردہ تھیں۔ جو اپنی سادگی اور صفائی کے ساتھ اخلاقی حیثیت سے بہت مفید ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں بچّوں کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن اب زمانہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ بچّوں، جوانوں، بوڑھوں سب کے لئے یکساں طور پر سامانِ دلچسپی مہیّا کرتی ہیں۔ مولانا کو دیہاتی منظر نگاری کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ انگریزی نظموں کا ترجمہ نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ہندی الفاظ کو نہایت

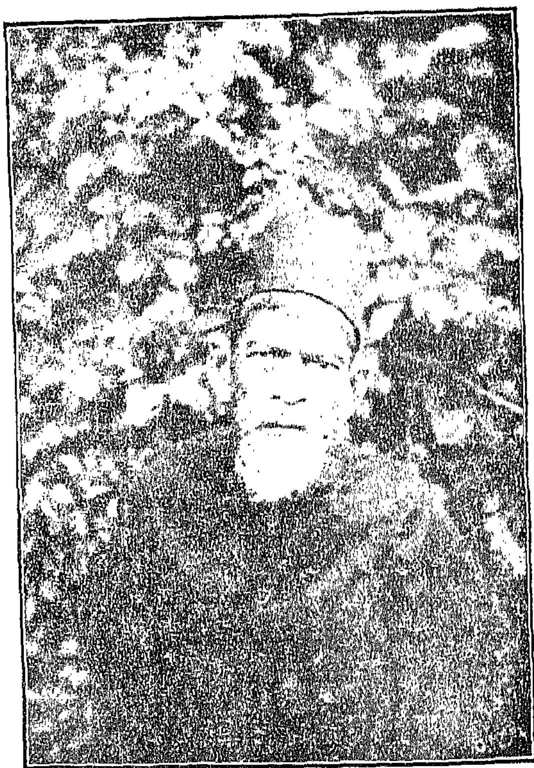
بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا کلام قومی اصلاح سے خالی نہیں۔ کلیات میں غزل، رباعی، قصیدہ وغیرہ اصناف بھی ملتی ہیں۔ اور اُن میں بھی آپ کا مرتبہ کسی طرح کم نہیں۔ لیکن آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی چھوٹی چھوٹی نظموں کی بنا پر ہے۔

**اکبر الہ آبادی**

سید اکبر حسین رضوی نام۔ اکبر تخلص۔ الہ آباد کے رہنے والے، ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری اسکولوں میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختارکاری کا امتحان پاس کیا اور نائب تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کے مثل خواں اور ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کرکے منصف ہو گئے۔ ۱۸۸۹ء میں سب آرڈینیٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ نے حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۹۰۳ء میں پنشن لی اور ادبی اور علمی زندگی بسر کرتے رہے۔ آخر ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔

اکبر کو شعر و سخن کا ابتدا ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ حضرت وحید الہ آبادی شاگرد خواجہ آتش لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ ابتدائی کلام پر قدامت اور تقلید کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مقررہ مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اسی دور کے کلام میں بجز اس کے کہ صفائی اور سادگی ہے اور کوئی خوبی نہیں۔ البتہ آئندہ ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ آپ کی غزل میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ چونکہ مزاج میں شوخی اور طبیعت میں ظرافت ابتدا سے تھی۔ اس لئے غزلوں میں بھی



اکبر الہ آبادی

یہی رنگ نمایاں ہونے لگا۔ تقلیدی اثر کم اور اُس کی جگہ ایک خاص رنگ رونما ہوتا گیا۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی، مذہبی، اصلاحی عناصر اُبھرنے شروع ہوئے لیکن ظرافت اور طنز کے پیرایہ میں۔ آخری دور میں یہی اِن کا رنگ ہو گیا۔

تین کلیات آپ کی یادگار ہیں۔ دو آپ کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے تھے۔ تیسرا آپ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

پیر مشقی کے عہد کی غزلیات بہت بلند پایہ ہیں۔ لطفِ زبان اور روانی کے ساتھ مضمون آفرینی اور نازک خیالی عجیب لطف دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے اشعار میں جدّت ادا اور ندرت بیان سے جان ڈال دیتے ہیں۔ سوز و گداز کی بھی کمی نہیں۔ زمین غزل میں نو بہ نو سیاسی، مذہبی اور سوشل مضامین کا اضافہ کیا ہے۔ اور ان مضامین کو اس لطف سے نظم کرتے ہیں کہ طبیعت پہ ذرا گراں نہیں گزرتے۔ مثلاً

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس — ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا
گُل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے — کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی قائم رکھا — رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سیّد اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہے اکبر — مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

اکبر کی شہرت عام طور پر اُن کی ظرافت کی بنا پر ہے۔ اگرچہ آپ مصلح قوم ہیں، مذہبی واعظ ہیں، صوفی ہیں، فلسفی ہیں۔ مغرب کی کورانہ تقلید کے دشمن ہیں۔ قدیم تہذیب کے حامی ہیں۔ لیکن آپ کی اصلاح، آپ کا وعظ اور آپ کی نصیحت ظرافت، بذلہ سنجی اور طنز لطیف کے نہایت باریک پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ آپ گمراہوں کے دل و جگر میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ اُن کی دُکھتی ہوئی رگ کو نصیحت کے نشتر سے چھیڑتے ہیں مگر اپنی ظرافت کی رنگینی سے انھیں روٹھنے اور بگڑنے نہیں دیتے بلکہ خفّت آمیز ہنسی ہنسا دیتے ہیں۔

ظرافت ایک کیفیت ہے اُس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ظرافت کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے تاہم اکبر کے کلام میں چند موٹی موٹی باتوں سے اُن کی ظرافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نئی اور انوکھی تشبیہات جن پر پھبتی کا اطلاق ہو سکتا ہے، محاوروں کا کوئی خاص استعمال، الفاظ کے عجیب و غریب معنی، غیر زبانوں کے الفاظ اور اُن کا انوکھا استعمال، عامیانہ اور مبتذل الفاظ کو خوبی سے استعمال کرنا مثلاً گٹ پٹ، فالتو وغیرہ۔ غرض یہ چند امور ہیں جن سے ظرافت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خاص خاص مطالب ادا کرنے کے لئے اکبر نے خاص خاص الفاظ ایجاد کیے ہیں اور اُن کا استعمال نہایت خوبی اور لطف کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً مِس، شیخ، سیّد، اونٹ، گائے، گرجا، مسجد، مندر، بُت، کالج، برہمن، لالہ، بدھو، جمّن، کلّو، ٹٹّو، ریل وغیرہ ہر لفظ سے آپ وہ کام لیتے ہیں جو متعدد جملوں سے بھی پوری طرح نہیں نکل سکتا۔

اب اُن کے کلام سے لطف اُٹھائیے :-

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں    اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا    کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے    بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی    یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

اگرچہ تسکین طبع ملت ہے حب قومی میں آہ کرنا
مفید تر ہے مگر دلوں کو رجوعِ سوئے اللہ کرنا
کہے کوئی شیخ سے یہ جا کر کہ دیکھئے آکے بزم سید
یہ رونق اور یہ چہل پہل ہو تو کیا برا ہے گناہ کرنا

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے
بتانِ مغربی سے ہیں تعارف کی تمنائیں
میں دیکھوں گا اُنھیں اور وہ مرا ایمان دیکھیں گے

باغوں میں نو بہار درختوں کی دیکھ لی    کالج میں آکے کانووکیشن کو دیکھئے
لیموئے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے    اب کاغذی ترقیٔ پنشن کو دیکھئے

---

## سرور جہان آبادی

منشی درگا سہائے نام، سرور تخلص۔ خلف حکیم پیارے لال صاحب۔ ۱۸۷۳ء میں بمقام جہان آباد ضلع پیلی بھیت پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔

سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھی اور انھیں سے مشورۂ سخن کیا۔ اُردو مڈل پاس کرنے کے بعد انگریزی کا شوق ہوا۔ دو سال کے عرصے میں انگریزی مڈل بھی پاس کیا۔ شعر و سخن کا چرچا جاری تھا۔ شروع میں وحشت تخلص تھا بعد میں سرور اختیار کیا۔

مشقِ سخن جاری تھی اور آپ کا کلام رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔ کہ دفعتاً آپ کی بیوی اور کچھ دنوں کے بعد اکلوتے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ ان حادثوں نے آپ کی طبیعت میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ غم غلط کرنے کے لئے دخترِ رز کو منھ لگایا۔ اور اس سے اس قدر یارانہ بڑھایا کہ کئی کئی روز تک مست و بیخود پڑے رہتے تھے۔ آخر اس کثرت نے نہالِ زندگی میں گھن لگا دیا۔ اور آپ ۱۹۱۰ء میں ۳۷ سال کی عمر میں سرگباشی ہوئے۔

سرور کے نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک "خمخانۂ سرور" مطبوعہ "زمانہ پریس" کانپور، دوسرا "جامِ سرور" مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد۔ ان دونوں مجموعوں میں "حبِ وطنی، سیاسی، تاریخی، اخلاقی وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔

سرور کے کلام میں صداقتِ جذبات، جوش، سادگی اور سوز و گداز کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ کلام مبالغے سے پاک اور حقیقت و اصلیت سے مزین ہے۔ نظموں میں تغزل کے رنگ سے تاثیر پیدا کی گئی ہے۔ پردیسی چیزوں کے دوش بدوش دیسی چیزوں کو بھی ممتاز جگہ دی ہے۔ مثلاً کوئل، بھونرا، ہنس، سارس، مرغابی، گنگا، جمنا، دمن، پدمنی وغیرہ۔ وطنی نظموں میں عقیدت، محبت اور جوش و خروش کا دریا اُبلتا نظر آتا ہے۔



پنڈت برج نرائن چکبست

## پنڈت برج نرائن چکبست

بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے مگر آپ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ چند سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں آپ کا نشوونما ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کردی۔ آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی میں آپ رائے بریلی گئے تھے۔ سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے۔ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی۔ حتی الوسع دوڑ دھوپ ہوئی مگر علاج کارگر نہ ہوا۔ آخر اسٹیشن ہی پر سات بجے شام کو انتقال کیا۔ آپ کے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست آپ کی لاش کو لکھنؤ لے گئے۔

شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے تھا۔ نو برس کی عمر سے شعر و سخن کا شغل جاری تھا اساتذہ میں آتشؔ، غالبؔ اور انیسؔ کے کلام کے آپ شیدا تھے۔ چنانچہ آپ کی غزل پر آتشؔ اور مسدس پر انیسؔ کی تقلید کا کا اثر نمایاں ہے۔

آپ کا مجموعہ کلام "صبح وطن" انڈین پریس الہ آباد نے شائع کیا ہے جس میں آپ کی نظمیں، مسدس، غزلیات وغیرہ شامل ہیں۔

چکبست کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ سلاست، چستی بندش، اور حسنِ ترکیب آپ کی خصوصیات زبان ہیں۔

غزلیات میں حسن و عشق کے افسانے بہت کم ہیں۔ اخلاقی مضامین

کی کثرت ہے فلسفۂ زندگی و موت کے مضامین اکثر پائے جاتے ہیں۔ اور حبِ وطنی کے جذبات کو بھی غزلوں میں سلیقے سے جگہ دی ہے۔ سادگی، بے تکلفی اور جوش آپ کی غزلیات کی خصوصیات ہیں۔

نظموں میں زیادہ تر مسدس ہیں۔ اُن پر انیس کی تقلید کا رنگ غالب ہے۔ زبان اور طرزِ ادا نہایت صاف اور رواں ہے۔ مسدسوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) حبِ قومی (۲) حبِ وطنی (۳) سیاسی (۴) احباب اور دیگر لیڈروں کے مراثی۔

مسدسوں میں صداقت جذبات کے علاوہ جوش پایا جاتا ہے۔ فلسفیانہ خیالات سے انھیں بھاری بھرکم نہیں کرتے۔ بلکہ سادگی سے جذبات کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں پند و نصیحت کا موقع آپڑتا ہے۔ وہاں واعظِ خشک نہیں ہونے پاتے بلکہ شاعرانہ لطافت ہر جگہ قائم رکھتے ہیں۔ سیاسی مسدسوں میں اپنی رائے کا نہایت آزادی سے اظہار کرتے ہیں اور سادگیٔ ادا کے جادو سے حرف حرف میں تاثیر بھر دیتے ہیں۔

---

## ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

اقبال کی ولادت ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ وطن مالوفہ سیالکوٹ ہے۔ لاہور کالج میں تعلیم پاکر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ ۱۹۰۵ء میں تکمیلِ علم کے لئے انگلستان گئے۔ وہاں فلسفے کے ڈاکٹر اور قانون کے بیرسٹر ہو کر ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔ آجکل لاہور ہی



ڈاکٹر سر محمد اقبال

میں مقیم ہیں

ابتدائے سن تمیز سے آپ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ حضرت داغ دہلوی کی اُستادی کا ہندوستان میں ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ اقبال نے بھی اُن ہی سے رجوع کیا اور بذریعہ خط و کتابت اُن سے اصلاح لینی شروع کی۔ ابتدا میں غزل کہا کرتے تھے۔ اُن میں داغ کی اصلاح کی بدولت صفائی اور سلاست کا جوہر موجود ہے۔ لیکن اقبال کی ذہانت اور جدّت پسند طبیعت غزل کے محدود دائرے میں کب رُک سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں۔

۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں آپ نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک قابل قدر نظم پڑھی۔ اس نظم نے اُس شہرت کی بنیاد رکھدی جو اب اطرافِ ہند اور بیرونجات میں پھیلی ہوئی ہے۔

انگریزی لٹریچر کے ماہر اور فلسفی ہونے کے علاوہ آپ کو غور و فکر اور تلاش و جستجو کا ذوق ابتدا سے ہے۔ اُردو کی تقلیدی شاعری کو چھوڑ کر آپ نے جدید رنگ کی نظمیں لکھیں۔ انگریزی نظموں کے نہایت کامیاب ترجمے کئے۔ نظموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) بانگ درا (۲) بال جبرئیل (۳) ضرب کلیم۔ یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

اقبال کا کلام ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایران، افغانستان، انگلستان وغیرہ ممالک میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے

خاطر خواہ آپ کی قدر دانی فرمائی۔ اور "سر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔
انگریزی لٹریچر کے زیر اثر اُردو میں اگر نو بہ نو خیالات و اسالیب کا اضافہ ہو سکتا ہے تو کلام اقبال اس کا بہترین نمونہ ہے۔ اگرچہ بعض پرستارانِ دہلی و لکھنؤ نے اِن کی زبان پر چند اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِن کے علوئے خیال، قومی ہمدردی، اخلاقی و معاشرتی اصلاح، علمی بیداری، قومی، مذہبی اور سیاسی ہمت افزائی کے سب قائل ہیں۔
اقبال کے کلام کا خلاصہ یا روح رواں ذیل کا شعر ہے:۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اِسی یقین، عمل، اور محبت کو آپ عجیب عجیب انداز سے فلسفیانہ رنگ میں رنگ کر پُرجوش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جگنو کو، ستاروں کو، چاند اور شبنم کو مخاطب کر کے کس کس بلند اور شاندار طریقے سے پیچیدہ مسائل کو حل کرتے ہیں! بادۂ حُبِ قوم و مذہب سے ہمیشہ سرشار رہتے ہیں اور نئے نئے انداز سے مسلمانوں کے افسردہ دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود ہی خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ اے خدا تو اپنے بندوں سے بے التفاتی برت رہا ہے اور خود ہی شکوہ کا جواب دیتے ہیں۔ اور سب الزام بندوں کے سر رکھتے ہیں۔ مسدس حالی کے بعد اگر اس پایہ کی کوئی نظم لکھی گئی ہے تو وہ اقبال کا "شکوہ" و "جواب شکوہ" ہے۔
آخر میں یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ نادر تشبیہات، لطیف استعارات

اور فارسی تراکیب اقبال کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ بندش چست ہوتی ہے۔ فارسی تراکیب کے باوجود روانی وسلاست قائم رہتی ہے اور اسی روانی کی وجہ سے خوشگوار ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ نمونہ کے طور پہ ایک نظم ملاحظہ ہو :۔

## زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانہ میں تیرا امتحاں ہے زندگی

## تبصرہ

**زبان** واضح ہو کہ دورِ جدید دورِ پنجم کا ہم عصر ہے۔ ایک طرف دورِ پنجم کی غزل سرائی ہو رہی تھی۔ دوسری طرف دورِ جدید کی نیچرل شاعری کے نغمے بلند ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں دورِ جدید کے نمایندے آزاد اور حالی خود بلند پایہ غزل گو اور اساتذہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اگر ان نمایندوں کی غزل سے سروکار رکھا جائے اور انھیں تاریخ ادب میں جگہ دی جائے تو

یہ دورِ پنجم کی بزم ہی کے مستحق ثابت ہونگے۔ اس لئے زبان کی اصلاح کے لحاظ سے دورِ جدید کو دورِ پنجم سے کسی طرح علیحدہ کرکے نہیں دکھایا جاسکتا۔ اور نہ لسانی اصلاح کے متعلق کوئی رائے پیش کی جاسکتی ہے۔ جو اصلاحیں دورِ پنجم میں ہوئیں۔ انھیں اصلاحوں سے دورِ جدید میں کام لیا گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ دورِ جدید کے شعرا نے جدید رنگ کی شاعری سے زبان میں نو بہ نو مضامین ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کردی۔ اور آیندہ شعرا کے لئے روشوں کو خاردار جھاڑیوں سے پاک و صاف کردیا۔ نئی پود اِنھیں راستوں پر چل کر کارہائے نمایاں دکھائے گی۔

جو زبان جدید شاعری کے لئے استعمال میں آئی اُس میں اور قدیم غزل کی زبان میں ایک خاص فرق محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ حالی اور اکبر الہ آبادی نے خاص خاص انگریزی الفاظ بے تکلفی سے نظم میں استعمال کئے۔ ہندی الفاظ بھی کافی تعداد میں استعمال ہوئے۔ سرور جہان آبادی نے مقامی اشیاء اور دیسی تلمیحات کو لطف کے ساتھ نظم کیا ہے۔

**اصنافِ سخن** غزل دورِ جدید کے لئے تقویم پارینہ ہے۔ غزل کو چھوڑ کر باقی تمام اصنافِ سخن اس دور میں خوب پھلی پھولیں۔ جن میں سے مسدس، مثنوی اور رباعی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اُردو کی مایۂ ناز نظم "مدوجزر اسلام" مسدس میں لکھی گئی۔ "شکوہ" "جواب شکوہ" مسدس میں لکھا گیا۔ چکبست کی تمام قابل قدر نظمیں مسدس میں ہیں۔ حالی اور آزاد کی تمام قومی اور نیچرل نظمیں مثنوی میں

ہیں۔ اقبال کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمیں مثنوی ہی میں ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے زیادہ تر رباعی اور قطعہ اور متفرق اشعار لکھے ہیں۔

**موضوعِ سخن** موضوعِ سخن کے لحاظ سے دورِ جدید بڑا گراں قدر سرمایہ اپنے پہلو میں لئے بیٹھا ہے۔ فلسفہ، اخلاق، نیچر، مجرد صفاتِ انسانی، تاریخی روایات، حب وطن، حب قوم، مذہب، معاشرت، سیاست، محبت، اتحاد، بے تعصبی، رواداری، قدیم تہذیب کی حمایت، مغرب کی کورانہ تقلید کی بیخ کنی، جوش عمل وغیرہ سیکڑوں عنوانات پر عجیب عجیب انداز سے خیالات وجذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اس دور میں مسلسل اور مستقل نظموں کا بڑا زبردست ذخیرہ جمع ہو گیا۔ تخلیقی شاعری کے علاوہ اس دور میں انگریزی اور دیگر زبانوں سے منظوم تراجم بھی ہوئے۔ جو ہر طرح قابلِ قدر اور مفید ہیں۔

**اسالیبِ بیان** اسالیب کے لحاظ سے بھی یہ دور گذشتہ تمام ادوار پر سبقت لے گیا ہے۔ جوش، صداقت، اصلیت، بے تکلفی، ترنم اور ہمواری تمام شعراء کی مشترک خصوصیات ہیں۔ اِن کے علاوہ اکبر کی ظرافت ملیح اور طنز لطیف، اقبال کا فلسفیانہ اندازِ بیان، چکبست کی صاف، سلیس اور ترنم ریز طرزِ ادا، آزاد کی سادہ رنگینی، حالی کی واعظانہ اور مصلحانہ سادگی و روانی، غرض گوناگوں اسالیب بیان آپ کو اس دور میں دکھائی دیں گے۔ قدم قدم پر تنوع نظر آئے گا۔ اور ہر جگہ گلہائے رنگارنگ جنت نگاہ بنے ہوں گے۔

**خامی** اِس دَور میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ سطورِ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اِس دَور میں موضوعِ سخن کی فراوانی ہے۔ یہ موضوع اُردو اور شعرائے اُردو دونوں کے لئے بالکل نئے تھے۔ ابتدائی دَور تھا۔ ابتدائی کوششیں تھیں۔ اس لئے کہیں کہیں اندازِ بیان میں خشکی اور بے رنگی آگئی ہے۔ اور محاسنِ شاعری نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ زبان و محاورہ کی بھی کہیں کہیں لغزشیں نظر آئیں گی لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں ہیں کہ اِس دَور کی جملہ خوبیوں کے مقابلے میں اِنھیں کچھ بھی اہمیّت دی جائے۔

**نتیجہ** پرستارانِ طرزِ قدیم اِس دَور کی شاعری کو خواہ کسی نظر سے دیکھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِن لوگوں کے لئے جو قدیم رنگِ شاعری سے مطمئن نہیں تھے، اِس شاعری نے سرمایۂ نشاط پیدا کر دیا ہے۔ اب وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ الحمد للّٰہ اب ہماری شاعری اس قابل ہو چلی ہے کہ ہم اِس کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کی محفل میں بطورِ نمایندہ پیش کر سکتے ہیں۔ اور وہ لوگ اِس خیال میں حق بجانب بھی ہیں۔

———>·<·※·>·<———

# باب ۱۱

# دورِ حاضرہ کے شعرائے صاحبِ طرز

[ گذشتہ تمام ادوار کی طرح دورِ حاضرہ میں بھی خوش گو شعرار کی کمی نہیں۔ لکھنؤ، دہلی اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اچھا خاصا کہنے والے شعرار موجود ہیں۔ لیکن اگر تمام خوش گو شعرار کا تذکرہ یہاں کیا جائے تو یہ کتاب ادبی تاریخ کی حیثیت سے گر کر محض تذکرہ بن جائے۔ اس لئے خاکسار راقم الحروف تمام شعرار اور اُن کے معتقدین سے معافی کا خواستگار ہے۔ ناچیز صرف انھیں شعرار کا تذکرہ اِس دور میں کرے گا جنھیں دنیائے ادب اُردو صاحبِ طرز مانتی ہے۔ اور جو خاکسار کے نزدیک صاحبِ طرز ہی نہیں بلکہ اپنی اُستادی یا اپنے کلام کے اثر سے ملک میں مقلدین کی ایک جماعت پیدا کر رہے ہیں ]

**صفی لکھنوی** علی نقی نام۔ صفیؔ تخلّص۔ خلف رشید مولانا سید فضل حسین۔ ۳ر جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ دس بارہ سال کے سن تک فارسی و عربی کی تکمیل کرتے رہے۔ اس کے بعد نائٹ اسکول میں انگریزی شروع کی۔ اور سال بھر کے بعد کیننگ کالجیٹ اسکول میں داخل ہوکر

انٹرنس تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۳ء میں محکمہ دیوانی میں آپ کا تقرر ہوا۔ مختلف مقامات اور مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۳ء میں چہل سالہ خدمات کے بعد پنشن پائی۔ اور اب گوشہ نشینی اختیار کرکے اُردو ادب کی خدمت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حضرت صفی فی زمانہ لکھنؤ میں مسلّم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں۔ بیسیوں موزوں طبع آپ کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر شاعر اور اُستاد ہو گئے۔ آپ کا کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔ ابتدائی کلام کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ آپ کی نظمیں اور غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مشاعروں میں بھی آپ اپنا کلام سُناتے ہیں۔ خاکسار نے الہ آباد کے مشاعروں میں اکثر آپ کا کلام سُنا ہے۔ اُن ہی مطبوعہ اور مشاعروں میں سُنی ہوئی نظموں اور غزلوں سے جو خاکسار نے آپ کے کلام کے متعلق رائے قائم کی ہے وہ سطور ذیل میں پیش کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت صفی نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن کو بدنامی کے دھبّے سے پاک کیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جس قدر کلام آپ کا منظرِ عام پر آچکا ہے اُس میں نہ مبالغہ کا عیب ہے، نہ رعایت لفظی کی بھرمار۔ ضلع جگت اور ابتذال جو لکھنؤ اسکول کی شاعری کی خصوصیت ہو گئی تھی اُس کا شائبہ بھی آپ کے کلام میں نہیں۔ لیکن مکمّل کلام پر مجموعی رائے قائم کرنے کے لئے ابھی آپ کے کلام کی اشاعت تک انتظار کرنا پڑے گا۔

سادگی آپ کی غزلیات کا خاص جوہر ہے۔ زبان اور طرزِ بیان دونوں

میں سادگی، صفائی اور دلکشی ہے۔ عاشقانہ مضامین کو نہایت مؤثر طریقے پر نظم کرتے ہیں۔ محاورات، روزمرّہ اور تشبیہات کا لطف بھی ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ فلسفۂ زندگی اور موجودہ عہد کے اہم مسائل پر بھی آپ نہایت خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں اور لطف یہ کہ تغزّل کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کلام کی پختگی آپ کی کہنہ مشقی اور اُستادی کو مسلّم کرتی ہے۔

نظمیں زیادہ تر شیعہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ بعض نظمیں عام دلچسپی کی بھی ہیں۔ آپ کی نظموں کا عام جوہر پُرجوش سادگی ہے۔ دوسرا جوہر دلکشی ہے۔ آپ نے دو چار نظمیں مختلف مقامات کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پر لکھی ہیں جو باوجود اپنے خشک موضوع کے دلکش اور پُرلطف ہیں۔ اُن نظموں میں الفاظ کے ذریعے سے جو تصویریں تیار کی گئی ہیں وہ ہر لحاظ سے داد کے قابل ہیں۔

ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ ہو:-

سیرِ گلشن دیکھئے سیرِ بیاباں دیکھئے — دل ہو قابو میں تو سب کچھ دیکھئے ہاں دیکھئے
اپنی اپنی گا رہے ہیں دونوں شیخ و برہمن — طے کبھی ہوتی ہے یہ بحثِ کفر و ایماں دیکھئے
حق شناسی نام اسی کا ہے کہ دل بھر آئے جب — دیر کو برباد یا مسجد کو ویراں دیکھئے
نقص بینائی سمجھئے فرق اگر آئے نظر — ایک ہی صورت کے ہیں گبر و مسلماں دیکھئے
دیر اُسی کو جانئے کعبہ اُسی کو مانئے — پوجئے وہ دل جسے ہمدردِ انساں دیکھئے
دل کے اندر آئیے کیجے حریمِ جاں کی سیر — زلزلوں نے جس کو ڈھایا ہے وہ ایواں دیکھئے
تا کجا سرمستئ نظارۂ باغ و بہار — چشمِ عبرت سے ذرا گورِ غریباں دیکھئے

مُہر بر لب دیکھئے محفل کی محفل زیرِ خاک — بیکسی کو ان خزانوں کا نگہباں دیکھئے

حال اپنا اب یہ ہے بیداریٔ احساس سے — سوتے سوتے جس طرح خوابِ پریشاں دیکھئے

ذرّے ذرّے کو زمینِ دل کے ہے اک اضطراب — کب خدا جانے ٹھہرتا ہے یہ طوفاں دیکھئے

انقلاباتِ جہاں کی فکر ہی کیا ہے صفیؔ
جو دکھائے گردشِ گردونِ گرداں دیکھئے

---

## ظریف لکھنوی

سید مقبول حسین نام۔ ظریفؔ تخلّص۔ جناب صفیؔ لکھنوی کے چھوٹے بھائی اور فخرِ لکھنؤ ہیں۔ عمر ایسی ہی کوئی پچاس پچپن کے قریب ہوگی۔ آپ کی شاعری کا رنگ آپ کے تخلّص سے ظاہر ہے۔ شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ لیکن طبیعت کی شوخی اور چلبلے پن نے ظرافت کی طرف مائل کیا۔ ابتداءً محض ہنسی ٹھٹھول سے سروکار تھا۔ دو چار شعر اس رنگ کے ملاحظہ ہوں:-

یہ چلم دکھا کے بولے میاں مجنوں سارباں سے
بھئی ایک کش لگا لو چلے آتے ہو کہاں سے

دیکھنا ہو آپ کو گر حُسنِ یورپ کی بہار
چاہے شلجم دیکھئے چاہے چقندر دیکھئے

اُن سے بچئے آپ جو پوست کے طالب ہیں حضور
مصحفِ رُخ چاٹ جائیں گے یہ جھینگر دیکھئے

---

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اِس نام کی　　کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتارام کی

---

بعض اوقات انسانی خامیوں کو کسی خاص انداز سے منظر عام پر لانا۔ ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جن لوگوں پر کھلا حملہ کیا جاتا ہے اُن کے دل پر خواہ کچھ بھی گزرے شاعر کو اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ کھسیانی ہنسی ہنس کر خود بخود (اپنی خامیوں کی اصلاح کرلیں تو شاعر کی توقعات سے زیادہ اُس کی ظرافت کا نتیجہ نکل آیا۔ اب اگر آپ چاہیں تو شاعر کو ادبی، مذہبی، سوشل، سیاسی مصلح کہہ لیجیے، آپ کو اختیار ہے۔ شاعر کے مدِ نظر تو محض ہنسنا ہنسانا تھا۔ ظریف صاحب کی شاعری کا دوسرا دور یہ ہے جو سطور بالا میں عرض ہوا۔ اس رنگ کے بھی دو چار شعر ملاحظہ ہوں:۔

لیڈری سستی ہوئی ہر چیز مہنگی ہو گئی　　ایک ہی آنہ میں مل جاتا ہے لیڈر دیکھیے

ڈاڑھی مونچھیں صاف ہیں مثلِ قلندر دیکھیے　　مادہ رو ہیں مغربی تہذیب کے نر دیکھیے

دہن غائب کمر معدوم اس پر حُسن کا دعویٰ　　حسین ایسا اگر ہو تو عجائب گھر کے قابل ہے

---

ظریف صاحب کی غزلوں کا عام رنگ یہی ہے، لیکن اب اُنھوں نے طولانی نظمیں مسدّس وغیرہ کی شکل میں لکھنی شروع کردی ہیں جو حقیقت میں بلند پایہ اور قابل قدر ادبی کوششیں ہیں۔ آپ کی طولانی نظموں میں "سفرنامۂ عراق" "گول میز کانفرنس"، "میونسپل الکشن"، "شعر آشوب" وغیرہ نہایت کامیاب

---

سلہ روزانہ انگریزی اخبار جوالہ آباد سے نکلتا ہے۔

اور مفید ہیں۔

ظریف صاحب کے موجودہ کلام کو دیکھ کر آپ کے سچے مصلح ہونے میں شک نہیں رہتا۔ آپ کی طولانی نظموں میں خندۂ دنداں نما کم ہے۔ تبسم زیرِ لب ضرور ہے لیکن وہ بھی سامعین کے چہروں پر غور و فکر کے آثار پیدا کر دیتا ہے۔ آپ ادبی، اخلاقی، مذہبی، سوشل، سیاسی خامیوں کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ دلوں میں تاثیر کے نشتر اُتر جاتے ہیں۔

آپ کی طبیعت ہمہ گیر ہے۔ مطالعہ فطرت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ آپ کا موضوعِ سخن زیادہ تر انسان ہے۔ شہری، دیہاتی، پردیسی غرض جس شخص کو لیتے ہیں اُس کی تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ آپ کو سیرت نگاری میں کمال حاصل ہے۔ اُردو زبان پر جو قدرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اُردو کے علاوہ پوربی زبان کو نہایت پُر لطف طریقے سے نظم کرتے ہیں۔ اُن کے دِہاتی اشخاص جب اپنی پوربی زبان میں ہلکی اور جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو محفلِ ادب میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

زبان میں لطفِ محاورہ، روزمرہ کی صفائی اور بندش کی چستی ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔ ابتذال اور عامیانہ پن سے التزاماً گریز کرتے ہیں۔ لیکن دِہاتی اشخاص کی زبان سے سبک اور سوقیانہ الفاظ کو روا رکھتے ہیں اِس سے بجائے عیب کے کلام میں اصلیت اور حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

---

**عزیز لکھنوی**

مرزا محمد ہادی نام، عزیز تخلّص۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ بزرگوں کا وطن شیراز تھا۔ شیراز سے کشمیر اور شاہانِ اودھ کے دَورِ حکومت میں کشمیر سے لکھنؤ آئے۔ مرزا صاحب ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم نہایت ذوق وشوق سے حاصل کی۔ اس کے بعد اساتذہ کا کلام ہمیشہ نظر سے گذرتا رہا جس سے آپ کا علم وفضل رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا۔ آخردم تک تعلیم وتعلّم کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر پچھلے سال ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا۔

شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ حضرت صفی سے استفادہ سخن کیا اور طبعی رُجحان اور کثرتِ مشق سے بہت جلد مرتبہ اُستادی حاصل کرلیا۔ آپ کی اُستادی مسلّم ہے۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور شبّیر حسن خاں جوش ملیح آبادی جیسے خوش گو شعرا نے آپ کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔

آپ کا مجموعہ غزلیات "گلکدہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ غزلیات کے علاوہ آپ کے قصائد بھی شائع ہوئے ہیں۔ دونوں صنفوں پر آپ کو قدرتِ کامل حاصل ہے۔

"گلکدہ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کی خصوصیات سے گریز کیا ہے۔ آپ کا کلام عام طور پر فرسودہ اور سوقیانہ مضامین سے پاک ہے۔ لوازمِ حُسن کی تعریف وتوصیف بھی کہیں نہیں ملتی۔

آپ متقدّمین میں میر اور متوسطین میں غالب کے دلدادہ ہیں اور انھیں

کی تقلید کرتے ہیں۔ غالب سے آپ نے متانت لی اور اندازِ بیان میں بھی انہیں سے استفادہ کیا۔ میر سے سوز و گداز لیا۔ لیکن مرثیہ کی ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر سوز و گداز کو آہ و بکا میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے کلام میں مرض، نزع، موت، نوحہ، ماتم، گورِ غریباں وغیرہ کے مضامین اِس کثرت سے ہیں کہ تمام کلام پر گویا مرثیت چھائی ہوئی ہے۔

زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ صفائی اور سلاست کی انتہا نہیں لیکن غالب کی تقلید میں فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ کرتے ہیں جن میں دو چار مقامات کو چھوڑ کر عام طور پر صفائی اور چستی پائی جاتی ہے۔

چند متفرق اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :—

انجام درد یہ ہے وہ آغازِ درد تھا
اب نیلگوں ہے چہرہ مگر پہلے زرد تھا

بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن

وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا
دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا

قضا کیا ہے دلی جذبات کا حد سے گزر جانا
وصالِ دائمی کیا ہے شبِ فرقت میں مر جانا

یادگارِ حُسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا
شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا

اُٹھے ہیں نیند سے جب سر پہ آفتاب آیا
مریضِ ہجر کی ایسوں کو قدر کیا ہو گی

---

**اصغر گونڈوی**

اصغر حسین نام۔ اصغر تخلّص ہے۔ اصلی وطن گورکھپور کے ضلع میں ہے لیکن ایک مدّت تک گونڈہ میں مقیم رہے۔ اِس لئے گونڈوی مشہور ہیں۔ آپ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی



مولانا اصغر حسین اصغر

تعلیم و تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی مدرسوں میں بھی تعلیم پائی۔ تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہو گئی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا کافی لطف اُٹھا سکتے ہیں اور اب تو یہ حال ہے کہ "ہندوستانی" کی اِڈیٹری کے سلسلے میں اگر کبھی کسی انگریزی کتاب یا مضمون کے ترجمے کا اتفاق ہوتا ہے تو اس بے تکلفی سے بے تکان ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں کہ اچھے اچھے ڈگری یافتہ مُنھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہی حال عربی اور فارسی کا ہے۔ خصوصاً فارسی پر آپ کو بڑا عبور حاصل ہے۔ کبھی کبھی فارسی میں بھی سخن سنجی کرتے ہیں۔

شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ زمانۂ نومشقی کے چار اشعار "خمخانۂ جاوید" میں نظر سے گزرے جن سے شاندار مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ وہ مستقبل اب حال ہے جس کا تذکرہ آئندہ آتا ہے۔ آپ نے مستقل طور پر کسی سے استفادہ نہیں کیا۔ ابتدا میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھایا۔ آخر میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھائیں۔ اس کے بعد سلسلہ بند ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی شاعر کے لئے اُس کے ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم سے بڑھ کر کوئی اُستاد ہو بھی نہیں سکتا۔

حضرت اصغر پہلے گونڈے میں مقیم تھے۔ وہیں آپ کا ایک چشمہ کا کارخانہ تھا۔ اس کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے اور وہاں ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ دنوں انڈین پریس الہ آباد سے بھی تعلق رہا۔ فی الحال "ہندوستانی اکاڈیمی" کے تماہی رسالہ "ہندوستانی" کے اڈیٹر ہیں اور

الہ آباد میں مستقل قیام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے انفاس میں برکت دے۔ؔ[۱]
خاکسار کو حضرت اصغرؔ سے نیاز حاصل ہے۔ آپ کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ ناچیز پر از بس بزرگانہ و مشفقانہ عنایت فرماتے ہیں۔ آپ کے وسیع اخلاق کے متعلق صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ حضرت اصغرؔ پکّے مسلمان ہیں لیکن زاہد خشک نہیں۔ مزاج میں رنگینی کہئے یا ظرافت، طبیعت میں مروّت کہئے یا لطافت۔ یا ان سب اوصاف کا مجموعہ۔ غرض دوست تو دوست اجنبی بھی آپ کی پُر مغز اور مسلسل گفتگو سے نہیں اُکتاتا۔ آپ بادۂ تصوف کے بھی ذوق شناس ہیں۔ حضرت قاضی شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے شرفِ بیعت حاصل ہے۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک "نشاطِ روح" ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا "سرودِ زندگی" ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ دونوں مجموعے اگرچہ مختصر ہیں لیکن اس اختصار میں بلند ترین شاعری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں حضرت اصغرؔ بہت کم گو شاعر ہیں اور اسی کم گوئی میں اُن کی شاعری کا راز مضمر ہے۔ فرمایا کرتے ہیں کہ پُر گوئی کے معنی میری لغت میں ہیں "رطب و یابس سے کلام کو بھر دینا۔ دو چار شعر اِس رنگ کے کہنا۔ دو چار اُس رنگ کے کہنا۔ کچھ اِدھر کے کچھ اُدھر کے۔ غرض چشم زدن میں لمبی چوڑی غزل تو تیار کر دینا لیکن خود اپنا رنگ کچھ نہ ہونا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصغرؔ صاحب نہایت

---

[۱] یہ کتاب زیرِ طباعت تھی کہ حضرت اصغرؔ نے بمرض فالج بتاریخ ۳۰؍ نومبر ۱۹۳۶ء داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی قبل از وقت رحلت سے دنیائے اُردو کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچا۔ آپ احاطہ مزار حضرت شاہ محب اللہؒ میں مدفون ہیں۔

کاوش سے شعر کہتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اُن کے کلام میں جس قدر ہمواری اور یک رنگی ہے اُس کی نظیر مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔

شعرائے ماضی و حال سے اصغرؔ صاحب کو صرف اس قدر تعلّق ہے کہ آپ بھی اُن کی طرح غزل گو ہیں۔ اِس کے سوا آپ کے کلام میں نہ کسی کی تقلید کا جلوہ ہے اور نہ تتبّع کی جھلک۔ آپ کی اجتہادی شان آپ کو محفلِ ادب میں سب حاضرین سے ممیّز و ممتاز کرتی ہے اور یہی اجتہادی اور غیر تقلیدی رنگ آپ کے فطری شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

اصغرؔ صاحب کی زبان اور اندازِ بیان میں لطافت اور جدّت ہے۔ زبان کی متانت اور سنجیدگی، اندازِ بیان کی شگفتگی اور رنگینی سے امتزاج پاکر کلام میں وہ دلآویز نُدرت پیدا کر دیتی ہے کہ تاثیرِ شعری خود وجد میں آتی ہے۔ تشبیہ و استعارات کا استعمال بھی ہے لیکن اصغرؔ صاحب کی تشبیہوں میں، نُدرت اور استعارات میں اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ یہ چیزیں سب نئی ہوں گی لیکن اِن میں لطافت اور نزاکت کی انتہا نہ ہوگی۔ نُدرتِ ادا کا یہ عالم ہے کہ معمولی سی بات بھی کہیں گے تو اِس انداز سے کہیں گے کہ دلکش اور انوکھی معلوم ہونے لگے گی۔

آپ کے کلام پر اگرچہ ذوقِ فارسیت غالب ہے تاہم آپ کی زبان میں صفائی اور برجستگی ہے۔ مصرعے ایسے ڈھلے ہوتے ہیں کہ سلاست اور روانی سے خود بخود ترنّم پیدا ہو جاتا ہے۔

خیالات و جذبات میں جوش اور صداقت بدرجۂ احسن موجود ہے۔ عامیانہ جذبات اور فرسودہ خیالات کی سطح سے گزر کر اصغرؔ صاحب کی نظر لطیف حقائق و معارف تک پہنچی ہے۔ جوش و مسرت، غم و رنج، ہجر و وصال، بیم و امید وغیرہ کیفیات سے متاثر ہونا اور اس تاثر کا کسی نہ کسی طرح اظہار کر دینا عام شعراء کا شیوہ ہے۔ اصغرؔ صاحب ان کیفیات سے متاثر ہو کر عالمِ بے خودی میں چلّا نہیں اٹھتے۔ بلکہ یہ کیفیات ان پر الہامی حالت طاری کر دیتی ہیں اور وہ فلسفہ و حکمت کی تہ میں اُتر جاتے ہیں۔ اور وہاں جن نتیجوں پر پہنچتے ہیں اُن کو شاعرانہ رنگینی اور لطافت سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ فلسفہ اور تصوّف کے خشک مسائل کو اصغرؔ صاحب جس رنگینی اور شعریت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں وہ خاص انھیں کا حصّہ ہے۔ حکیمانہ خیالات کے اظہار میں ہمیشہ لطافت اور دلآویزی ملحوظ رہتی ہے۔ آپ کے کلام میں جوش، ترنّم، سکون، اضطراب، سرمستی اور بے خودی کے امتزاج سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ سامعین و قارئین کے دل و دماغ پُرکیف سرور اور رقص کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

آپ کے حکیمانہ خیالات میں اتحاد و یکرنگی پائی جاتی ہے۔ فلسفۂ اضافیت کو جس جس انداز سے آپ نے کہا ہے اُس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ مثال کے طور پر محض حُسن و عشق کو لیجیے۔ آپ کے نزدیک حُسن و عشق کوئی علیحدہ اور مستقل ہستی نہیں رکھتے۔ بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود پر مبنی ہے۔ عام زبان میں اِس مضمون کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ عاشق میں جس درجہ کا ذوقِ نظر ہے، معشوق میں اُسی درجہ کا حُسن ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

ہاں وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصّے　　موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا
وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں　　سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنّا سے

سوز و گداز غزل کی خصوصیت ہے۔ اگر اس سوز و گداز سے یاس و حسرت، آہ و بکا، گریہ و زاری، فریاد و ماتم وغیرہ مراد لی جائے تو اصغرؔ صاحب کا کلام ایسے سوز و گداز سے یکسر پاک ہے۔ خود فرماتے ہیں :-

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغرؔ　　یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

ایک جگہ اور فرمایا ہے :-

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیّل چاہیئے　　مجھ کو اصغرؔ کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

لیکن اگر سوز و گداز دل کی ایک لطیف دردمندانہ کیفیت کا نام ہے تو اصغرؔ صاحب کا کلام ایسے سوز و گداز سے لبریز ہے۔

آخری اور شاید بہترین خصوصیت آپ کے کلام کی یہ ہے کہ آپ کے اشعار فکر انگیز اور خیال افزا ہوتے ہیں۔ غزلیات کے مطالعہ سے لطیف اور بلند جذبات دل میں اُبھرتے ہیں۔ چنانچہ آج سے آٹھ نو سال پیشتر جب "نشاطِ روح" اوّل اوّل خاکسار کی نظر سے گزری تو چند صفحات کے مطالعہ سے جو تاثیر ناچیز کے دل پر مترتّب ہوئی اُس کا اظہار اس طرح ہوا تھا ؎

معجز نما کلام ہے اصغرؔ کا اے صغیرؔ　　افسردہ دل کو محشرِ جذبات کر دیا

اب حضرت اصغرؔ کے چند اشعار سے لطف اُٹھائیے :-

کیا کہیے جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو　　سیراب کر دیا دلِ منّت گزار کو
جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجومِ شوق !　　تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق میں | آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں | ہزاروں بن گئے سجدے جبیں میں نے جہاں رکھ دی
کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم | کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
موجِ نسیمِ صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے | اور بھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں
بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا | کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو
سُنا ہے حشر میں شانِ کریمی تاب نکلے گی | لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو
نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں | کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
رسمِ فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر | اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

---

**جگر مرادآبادی** علی سکندر نام، جگر تخلّص۔ مرادآباد آپ کی وطنیت پر فخر کرتا ہے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ آپ کے والد علی نظر شاعر اور صاحبِ دیوان تھے۔ اور خواجہ وزیر لکھنوی سے انھوں نے اصلاحِ سخن لی تھی۔ جگر صاحب کی ابتدائی تعلیم معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ انگریزی سے بھی کچھ واقفیت ہے۔

آپ کی عمر اس وقت کوئی پچاس کے قریب ہوگی۔ میانہ سے کچھ کم قد۔ سنہری۔ سیاہ گوں۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی۔ سر کے بال پریشان۔ لباس سے بے پروا۔ بظاہر شاعری کے مجنوں لیکن شگفتہ مزاج اور رنگین طبع۔ مستقل قیام کا فخر کسی خاص مقام کو حاصل نہیں۔ جہاں کسی قدردان نے مدعو کر لیا کچھ دن گزار دیے۔

آپ نے ذوقِ سخن ترکہ میں پایا۔ ابتدائً والد بزرگوار سے مشورۂ سخن کیا۔ اُن کے بعد داغ سے فیض پایا۔ کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو بھی دکھائیں۔ لیکن ابتدائی کلام پر داغ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک "داغ جگر" اور دوسرا "شعلۂ طور"۔ لیکن اِن دونوں مجموعوں کا رنگ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔ "داغ جگر" کی خصوصیات سادگی، روانی، دل نشین فارسی تراکیب، شوخی، معاملہ بندی اور جذبات وخیالات میں عُمق وغیرہ ہیں۔ تعجب ہے کہ جگر صاحب "داغ جگر" کو پسند نہیں فرماتے۔ خاکسار نے خود اُن کی زبانی سُنا ہے کہ جگر اب وہ جگر نہیں رہا۔ "داغ جگر" بھی اُسی جگر کے ساتھ ختم ہوا۔ موجودہ جگر کو سمجھو تو موجودہ کلام سے سمجھو"۔ آپ کا یہ قول خواہ شاعرانہ وارفتگی پر مبنی ہو لیکن اِس میں بہت کچھ اصلیت بھی پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں اصغر صاحب گونڈے میں چشموں کا کاروبار کرتے تھے، جگر صاحب چشموں کی ایجنٹی کیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں جگر صاحب کو اُن سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ صحبتیں گرم اور شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے۔ اُسی زمانہ میں جگر صاحب کو اصغر صاحب سے عقیدت پیدا ہو گئی چنانچہ آجکل یہ حالت ہے کہ آپ اصغر صاحب کے روبرو دوزانو باادب بیٹھتے ہیں۔ اگر اُن کے یہاں قیام کرنے کا موقع ملتا ہے تو وضعِ رز سے بگاڑ اور پنج وقتہ نماز کی پابندی کر لیتے ہیں۔ مشاعروں میں اُن کی غزل خود پڑھتے ہیں اور اگر کوئی اور پڑھنا چاہے تو اُس سے بگڑ جاتے ہیں۔ اصغر صاحب کو بھی آپ کی خاطر اور دل دہی منظور ہوتی ہے چنانچہ انھیں سے غزل پڑھواتے ہیں۔ اِس عقیدت کی وجہ پردۂ راز میں ہے لیکن کسی کسی حلقے میں لوگوں کا خیال ہے کہ جگر حضرت اصغر کے شاگرد ہیں۔

اگر اُستادی و شاگردی کو عام معنوں میں سمجھا جائے تو یہ غلط ہے کہ جگر صاحب آصغر کے شاگرد ہیں۔ ورنہ آصغر صاحب کی صحبت اور اُن کے کلام کا جو اثر جگر صاحب کے کلام پر پڑا ہے اُس کے رو سے ایک معنی میں آپ ضرور اُن کے شاگرد ہیں۔ اور اس تاثر کا جلوہ "شعلۂ طور" میں صاف نظر آتا ہے۔

سطور بالا سے "داغ جگر" اور "شعلۂ طور" کے باہمی فرق کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ "شعلۂ طور" میں سادگی، روانی، اور دل نشین فارسی تراکیب وہی ہیں جو "داغ جگر" میں۔ لیکن شوخی اور معاملہ بندی، کیف، وارفتگی، بیخودی اور والہانہ اندازِ بیان سے بدلتی ہے۔ اِن پر رنگینی اور دلکشی کا اضافہ ہوتا ہے۔ متانت اور پختگی بڑھتی ہے۔ تخیل میں بلندی اور جذبات میں جوش و صداقت پیدا ہوتی ہے۔ حقائق و معارف کی شاعرانہ رنگینی سے کلام میں گہرائی اور عُمق پیدا ہوتا ہے۔

جگر صاحب کے کلام میں حُسن ہے۔ خواہ حُسن ادا کہئے خواہ حُسن تخیل، غرض حُسن ہے اور شعر میں حُسن کا ہونا شاعری کی معراج ہے۔ آپ کے پڑھنے کا طرز بھی عجیب والہانہ ہے۔ ایک مخصوص ترنم سے اس طرح پڑھتے ہیں کہ شعر کے حُسن تاثیر کی انتہا نہیں رہتی۔ اطرافِ ہند میں جہاں ان کے رنگ شاعری کی تقلید کی جارہی ہے وہاں اِن کے ترنّم سے بھی مشاعروں کو گرمایا جاتا ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ درج کیئے جاتے ہیں۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آہی گیا ۔۔۔ دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آہی گیا
ہائے یہ حُسنِ تصوّر کا فریبِ رنگ و بو ۔۔۔ میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں ۔۔۔ فی الحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال ۔۔۔ در پردہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا

فنائے عشق کو رنگ بقا دیا تو نے ۔۔۔ حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تو نے
ہزار جانِ گرامی فدا بایں نسبت ۔۔۔ کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تو نے
یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشق لامحدود ۔۔۔ مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے
ہزار دل کو مٹا کر دیا مجھے اک درد ۔۔۔ اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے
ہر ایک دل کو عطا کر کے مدعائے حیات ۔۔۔ جگر کو اک دلِ بے مدعا دیا تو نے

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے ۔۔۔ جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے
روک سکتی ہو تو بڑھ کر روک لے منزل مجھے ۔۔۔ لے اڑی ہے ایک موجِ بیقرارِ دل مجھے
پھونک دے اے غیرتِ سوزِ محبت پھونک دے ۔۔۔ اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

---

## فانی بدایونی

شوکت علی نام ۔ فانی تخلص ۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے ۔ فانی صاحب کے والد مرحوم محمد شجاعت علی خاں محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے ۔ انھیں اپنے بیٹے کے لئے کسی آزاد پیشے کی تمنا تھی ۔ چنانچہ انھوں نے فانی صاحب کو وکالت کے لئے مجبور کیا ۔ آپ نے انٹرنس تک اپنے وطن بدایوں ہی میں تعلیم پائی ۔ بریلی کالج سے بی ۔ اے اور الہ آباد اور علی گڑھ سے ایل ایل بی پاس کیا ۔ آجکل آپ حیدر آباد دکن میں تشریف رکھتے ہیں ۔

شعر و سخن کا شوق بچپن سے دامنگیر تھا ۔ ان کے والد انھیں شعر گوئی سے روکتے تھے اور یہ پوشیدہ طور پر کہتے رہتے تھے ۔ ایک مرتبہ بذریعہ خط و کتابت

کر دینا پڑا۔ غرض یہ کہ آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ مذاق صحیح اور وجدانِ سلیم نے آپ کی رہنمائی کی اور آخر راہِ راست پر ڈال دیا۔

آپ نے تین دیوان تصنیف کئے تھے۔ دو مثنویاں اور دو ڈرامے بھی لکھے۔ مگر آپ کی عدم توجہی سے یہ ذخیرہ تلف ہوتا رہا۔ آخر بچا کھچا کلام "باقیاتِ فانی" کے نام سے شائع کیا۔

آپ کی زبان عام طور پر شیریں اور صاف ہے۔ فارسی تراکیب بھی دلکش اور مناسب ہیں لیکن کہیں کہیں مضمون کی گہرائی اور تخیل کی بلندی کی وجہ سے تراکیب میں پیچیدگی اور ثقالت آگئی ہے۔ لطف محاورہ بھی موجود ہے۔ خاص خاص محاورے زبان پر زیادہ چڑھے ہوئے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے "باقیات فانی" پر مقدمہ لکھا ہے آپ فرماتے ہیں کہ "فانی یاسیات کے امام ہیں"۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے کلام میں سوز و گداز، یاس و حزن و ملال کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ لہجہ ایسا دردناک ہے کہ دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس ضمن میں مشہور و معروف غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :۔

مآلِ سوز غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ — بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ
غرورِ حُسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے — کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

---

ہے۔ فرماتے ہیں۔ "غالب کی مانند فانی کو بھی تجردات سے بحث کرنے کا خاص ذوق اور اس کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔ اُن کو دقیق سے دقیق مسئلہ کی تشریح و تفسیر کے لئے بھی غیر مانوس یا دقیق الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُن کو غالب کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت دی جاسکتی ہے مگر بہر حال الفضل للمتقدم۔ علاوہ بریں وہ غالب کی مانند متنوع نہیں یعنی اُنھوں نے غالب کی طرح زندگی کے ہر پہلو کا ہر نقطۂ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔"

فانی صاحب کے کلام میں تصوّف کی چاشنی بھی ایک پُر لطف حد تک موجود ہے۔ بیان و خیال میں عام طور پر نُدرت و جدّت پائی جاتی ہے۔ جذبات میں پُر درد جوش کے ساتھ اضطراب اور کشمکش کی آمیزش شعر کو نازک اور پُر لطف بنا دیتی ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :—

امکانِ معرفت کو سمو کر محال میں — وہ دل میں یوں رہے کہ نہ آئے خیال میں
ٹوٹا نہ ہم سے رشتۂ رسمِ حجابِ عشق — چھوٹا نہ ہم سے ہجر کا دامن وصال میں
قدموں پہ گر کے کوئی خطا کار مر نہ جائے — ذوق آفرینیاں ہیں تمھارے ملال میں
ملتی نہیں تصوّرِ ہستی سے اب نجات — گھر سا گیا ہوں حلقۂ دامِ خیال میں
آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا — لانا پڑا انھیں کو تمھاری مثال میں

---

[illegible]

صاحب "بستان حکمت" (ملاحظہ ہو حصہ نثر فورٹ ولیم کالج) کے پڑپوتے ہیں۔
جوش لڑکپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے تعلیم و تربیت بخاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی۔

شعر و سخن کا ذوق ابتدا سے تھا۔ زمانہ طالب علمی میں مشق سخن جاری تھی۔ خداداد ذہانت اور مذاق سلیم نے رہبری کی اور عہد حاضرہ میں صاحب طرز شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

ابتداءً زمینداری کا کام کرتے رہے۔ پھر دارالترجمہ جامع عثمانیہ کے شعبہ تالیف و ترجمہ میں ادبی نقاد کی خدمات انجام دیتے رہے۔ فی الحال دہلی میں اقامت گزیں ہیں اور "کلیم" نامی رسالہ نکالتے ہیں۔

جوش صاحب کو غزل اور نظم دونوں پر قدرت کامل حاصل ہے۔ آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی نظموں کی وجہ سے ہے۔

غزل میں صفائی، روانی اور سلاست بہت ہے۔ فارسی تراکیب میں بندش کی چستی اور دلکشی موجود ہے۔ سوز و گداز دل پسند حد تک پایا جاتا ہے۔ صوفیانہ مضامین اور معرفت کے رموز بھی نہایت سادگی سے نظم ہوئے ہیں۔ ابتذال اور عامیانہ پن سے کلام یکسر پاک ہے۔

نظم میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ نظموں میں جوش، سادگی اور صداقت بدرجۂ احسن موجود ہیں۔ تشبیہات میں ایک طرح کی ندرت ہے جس سے کلام کا

پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جذبات کی آڑ میں جو دھندلی سی تصویر ہوتی ہے وہ بہت دلکش ہوتی ہے۔ کلام عام طور پر بلند پایہ اور معیاری ہوتا ہے۔ یاس وحرماں نصیبی کا کہیں پتا نہیں ملتا۔

بطور نمونہ چند رباعیات پیش کی جاتی ہیں جن سے کلام کی شوخی کا ایک حد تک اندازہ ہوگا۔

مرنے پہ نوید جاں ملے یا نہ ملے　　　یہ کنج یہ بوستاں ملے یا نہ ملے
جینے میں تو کسر نہ چھوڑ اے خانہ خراب　　　معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

---

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے　　　تفسیر مآلِ شادمانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انھیں　　　جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

---

دل ہوتا ہے روبراہ گاہے گاہے　　　رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے خودی خدا نہ بن جائے کہیں　　　کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

---

گردوں سے بلند ہے نشیمن اپنا　　　فردوس پہ خندہ زن ہے گلشن اپنا
تو کوثر و تسنیم کا چھوڑے گا نہ فکر　　　اچھا تو نچوڑ دوں میں دامن اپنا

---

زبان

اس دَور میں آپ کو کوئی شاعر روایتی اُستاد کی حیثیت لئے ہوئے نظر نہ آئے گا۔ فی زمانہ یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ روایتی اُستادی اور شاگردی کا زمانہ اب ختم ہو گیا۔ جو علوم و فنون اساتذہ کے سینوں میں چھپے ہوئے تھے اور جن کے حصول کے لئے اُن کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ علوم و فنون اب کتب فروشوں کی دکانوں سے نہایت ارزاں قیمت پر خریدے جاسکتے ہیں۔ متروکات کی لمبی چوڑی فہرست اور توضیح قواعد و قوانین کا اب زمانہ نہیں رہا۔ شخصی سعی و کوشش کی قدر و قیمت نہیں رہی۔ اب رنگ زمانہ جگت اُستاد ہے۔ مدعا یہ ہے کہ شعرا کی توجہ اصلاح زبان کی طرف نہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اساتذۂ متوسطین کے احسانات سے زبان منجھ کر اس قدر صاف ہو چکی ہے کہ اب مزید اصلاح کی حاجت نہیں رہی۔ یا یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شعرا کا رجحان زیادہ تر تخیل کی بلندی اور مضمون کی ندرت کی طرف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جذبات کی صداقت، تخیل کی بلندی اور کلام کا جوش و خروش خود بخود زبان کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔

بہرکیف زبان کی کچھ نہ کچھ ترقی اس دَور میں بھی نظر آتی ہے۔ مغربی اثر اور سائنس اور فلسفہ کی جہانگیری سے خیالات کی دنیا متاثر ہوئی۔ خیالات کا تاثر زبان پر اثر انداز ہوا۔ جس کی وجہ سے زبان میں ادائے مطالب کی وسعت بڑھنی شروع ہوئی۔ موجودہ شعرا کا خیال ہے کہ ادائے مطالب کی وسعت

میں نہیں۔ لہذا یہ دور فارسی تراکیب کے اعتدال ... 
کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فارسی تراکیب سے زبان میں جو وسعت، جو حُسن اور نزاکت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ فارسی تراکیب کے استعمال میں بے اعتدالیاں بھی ہو رہی ہیں۔ لیکن جو فطری شاعر ہیں اُن کا کلام اعتدال کی عمدہ مثال ہے

**اصنافِ سخن**

فی زمانہ اگرچہ نظموں کی کمی نہیں۔ ادبی رسائل میں اُن کی بھرمار ہے۔ لیکن خاکسار کو ان نظموں سے کسی شاندار مستقبل کی توقع نہیں۔ ناچیز کے نزدیک اس دَور کی غزل تمام اصنافِ سخن پر بھاری ہے اور یہی اس دَور کی خاص صنعت ہے۔

**موضوعِ سخن**

غزل کا خاص موضوع اگرچہ حُسن و عشق ہی ہے لیکن حُسن حسنِ مطلق ہے اور عشق عشقِ حقیقی۔ جذبات میں صداقت ہے اور واردات میں اصلیت۔ تصوّف اور فلسفہ بھی اس دَور کا خاص موضوع ہے لیکن حقائق و معارف کے بیانات میں شاعرانہ لطافتیں موجود ہوتی ہیں۔ حیاتِ انسانی اور نفسیات کا گہرا مطالعہ بھی اس دَور کی خصوصیت ہے۔

**اسالیبِ بیان**

فرسودہ مضامین اور عامیانہ اندازِ بیان اس دَور میں مفقود ہے۔ طرزِ ادا زیادہ تر حکیمانہ ہے لیکن کلام میں خشکی اور بے رنگی نہیں آنے پاتی۔ کیف و سرور، بے خودی و سرمستی، رنگینی و رعنائی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ترکیب پاکر کلام میں تڑپ اور اثر پیدا کر دیتی ہیں۔

اور یہ اس دور
سمجھنا چاہیے حقیقی معنوں میں - کو ایک کرکے دکھا دیا ہے - اِس
نے عشق مجازی اور عشق حقیقی
اس اسلوب سے ہے - آپ آجکل کے اشعار کو
دور کی شاعری کا لب و لہجہ متین اور مہذب
غرض اس دور کے اسلوب بیان
ہر سوسائٹی میں بلا تکلف پڑھ کر سنا سکتے ہیں -
نے غزل کو بہت بلندی پر پہنچا دیا ہے -

**نتیجہ**

غالب نے غزل کی زمین میں جو تخم بویا تھا موجودہ زمانہ میں وہ سرسبز و
شاداب ہوا ہی نہیں بن گیا ہے بلکہ بار آور بھی ہو رہا ہے - اُردو شاعری
کی معرکۃ الآرا صنف یعنی غزل اس دور میں معراج کمال پر پہنچ گئی ہے - ایک
زمانہ میں جو اس کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی تھی اس وقت وہ بدگمانی
خوش اعتقادی سے بدل چکی ہے اور یقین ہوتا جاتا ہے کہ غزل ہی تمام اصناف
کی سرتاج ہے -

# اُردو نثر کی ابتدا ـ مذہبی دَور

## ۱۳۹۸ء سے ۱۷۹۰ء تک

**تمہید** | مولانا محمد حسین آزاد "آبِ حیات" میں فرماتے ہیں کہ "یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچّہ پہلے شعر کہے پھر بات کرنی سیکھے" اس سے اُن کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ ادب اُردو میں نظم نثر سے قدیم ہے۔ موصوف کے نزدیک وَلی (۱۶۶۸ء-۱۷۴۴ء) اُردو شعر و شاعری کے باوا آدم ہوئے۔ اس عہد میں آپ کو اُردو نثر کا سراغ نہیں ملتا۔ آپ کے نزدیک فضلی کی "دہ مجلس" اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب وَلی سے کوئی نوے سال بعد ۱۷۳۳ء میں لکھی گئی ہے۔

لیکن زمانۂ حال کی تحقیق و تجسّس نے اس خیال کا قطعی عکس ثابت کر دکھایا ہے۔ موجودہ تحقیق کی رو سے "بچّے نے پہلے بات کرنی سیکھی پھر شعر کہا" حصّہ نظم کے ابتدائی دَور (دکن میں) باب دوم میں دکھایا جا چکا ہے کہ نظم کی ابتدا یوسف عادل شاہ کے عہدِ حکومت سے (۱۴۹۰ء-۱۵۱۸ء) ہو چکی تھی۔ اِسی طرح نثر کے باب میں موجودہ تحقیق، تلاش و جستجو کرتی ہوئی ۱۳۹۸ء تک پہنچتی ہے اور "معراج العاشقین" کو اُردو نثر کی پہلی کتاب پاتی ہے۔ اگرچہ قیاس کہتا ہے کہ نثر کی عمر اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ مصنّف

"اردوئے قدیم" کی رائے میں شیخ عین الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ (۱۳۹۲ء) کے رسالے نثر کے قدیم ترین نمونے ہیں لیکن چونکہ یہ رسالے دستیاب نہیں ہو سکے لہٰذا عملی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے "معراج العاشقین" ہی کو اُردو نثر کی پہلی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ تحقیق و جستجو ابھی ہمت ہار کر نہیں بیٹھی ہے۔ اس کی سرگرمی ہنوز جاری ہے۔ لہٰذا ابھی سے کوئی آخری فیصلہ کر دینا قبل از وقت ہوگا۔

اس ابتدائی دَور کو مذہبی دَور اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں جو تصانیف ملتی ہیں وہ زیادہ تر مذہبی مقاصد کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اور عوام کی زبان یعنی اُردو کو اشاعت و تبلیغ اسلام کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

**۱۔ معراج العاشقین** | اس وقت تک اولیت کا فخر اِسی تصنیف کو حاصل ہے۔ حضرت ابوالفتاح صدر الدین سید محمد حسینی گیسو دراز (متوفی ۱۴۲۱ء) نے اِسے ۱۳۹۸ء میں تصنیف کیا۔ نمونہ عبارت یہ ہے :۔

"نبی علیہ السلام کہے، انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پیلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا امّارہ، یعنی واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سنا سو۔ حسد کی نک سوں۔ بدبوئی نہ کینا سو۔ بُغض کی زبان سوں بدگوئی نہ کینا سو۔ کینہ کی شہوت کوں غیر جاگا خرچنا، پیر طبیب کامل ہونا، نبض پچھان کو دوا دینا سو۔

طبیب عشق را دُکان کدام است علاج جاں کند او را چہ نام است

پیر منع کیئے سو پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی۔ مشاہدے کے کلنے میں ہیکائیل کے

مدد کے پانی سوں جلی کا کاڑا کر کو پلانا۔ سگن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو تو شفا پاوے گا۔ طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرے تو اسے تے بھی طبیب ہووے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی۔ ماٹی میں پانی۔ ماٹی میں آگ۔ ماٹی میں بارا۔ ماٹی میں خالی۔ ان پانچ عناصران کا واجب الوجود بوجا تو معرفت تمام ہوا۔"

"معراج العاشقین" کو حال ہی میں مولانا عبدالحق صاحب نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے۔

"معراج العاشقین" کے بعد تقریباً ایک صدی تک کسی تصنیف وتالیف کا سراغ نہیں ملتا۔ "اردوئے قدیم" میں چند بزرگوں کے دو ایک اردو فقرے لکھے ہیں لیکن اِن فقروں کو اُردو کی مستقل تالیف نہیں کہا جاسکتا۔

**۲۔شرح مرغوب القلوب** حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری متوفی ۹۰۲ھ کا تذکرہ باب دوم میں گذر چکا ہے۔

"شرح مرغوب القلوب" آپ ہی کی تالیف ہے۔ سال تالیف معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ ۹۰۲ھ سے قبل ہی تصنیف ہوئی ہو گی۔ نمونہ عبارت یہ ہے:۔

"پیغمبر کیے جے کچ کام کرسے گا کوئی خدا ناؤں نا لیکر تو وہ کام پائمال ہو گا۔ سرانا، نوازنا خدا کو بہوت کہ او پالن ہارا ہے عالم کا۔"

**۳۔کلمۃ الحقائق** شاہ برہان الدین جانم کا تذکرہ بھی باب دوم میں گزر چکا ہے۔ یہ تصنیف آپ ہی کی ہے جو ۹۹۰ھ سے قبل تصنیف کی جا چکی تھی۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

سوال:۔ یہ تن الادھا (علیحدہ) بلکہ ستھنتر پکار روپ دستا ہے۔ یک

تل قرار نہیں جیوں مرکٹ روپ۔

جواب۔ اسے عارف! ظاہر تن کے فعل تے گذریا و باطن کر تب دستے۔ اس کا قانون سو ممکن الوجود۔ دوسرا تن سو بھی کہ اس اپنا رین کا بکار و جٹنا کرن ہارا سو دہی تن نہیں تو یو خاک و سوکھ دو دکھ بھوگن ہارا۔ جیتا بکار روپ وہی دوسرا تن تو توں نظر کر دیکھ یہ تن فہم سوں گزریا۔ تو گن اُس کا کیوں رہے۔"

**۴۔ احکام الصلوٰۃ** | یہ کتاب ۱۶۲۲ء میں قطب شاہ کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف مولینا عبداللہ ہیں۔ نمونہ عبارت یہ ہے:۔

"بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا منگنے نماز جاتا ہے۔ واہ کہے سوں نماز جاتا ہے۔ درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی موت کی خبر سن کر قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون ٥ بولنے سوں نماز جاتا ہے۔ مصحف دیکھ کر پڑنے سوں نماز جاتا ہے۔ قہقہہ ہنسنے سوں نماز جاتا ہے۔

**۵۔ سب رس** | یہ تصنیف اس دور کی مایۂ ناز ادبی کوشش ہے۔ اسے ملّا وجہی معاصر سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ۱۶۳۵ء میں تصنیف کیا۔ حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب نے اسے مع مقدمہ اور فرہنگ کے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ادبی نقطۂ نگاہ سے قدیم اُردو میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں حُسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ طرزِ بیان بھی اس دور کی تصانیف سے مختلف ہے۔

تمام عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے۔ لیکن روانی اور سلاست کا رشتہ کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:—

زینتِ سخن و تسمیہ کتاب

"یو قدرت اللہ ہے۔ یو اسرار اللہ ہے۔ یہ ہاتف اللہ ہے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ یو عجیب کتاب ہے۔ سبحان اللہ۔ اس کتاب کا ناؤں "سب رس" سب کوں پڑھنے آوے ہوس۔ بول بول کوں جڑے اس۔ یادگار ہوا پچھیگا دنیا میں کئی لاکھ برس۔ بہوت کچھ (بہت ہی) شیریں بہوت کچھ لذیذ۔ عاشقاں کے گلے کا تعویذ۔ یو کتاب سب کتاباں کا سرتاج۔ سب باتاں کا راج۔ ہر بات میں سو سو معراج۔ اس کا سواد سمجھے نا کوئی عاشق باج۔ اس کتاب کی لذت پانے عالم سب محتاج۔ کیا عورت کیا مرد۔ جس میں کچھ عشق کا درد۔ اس کتاب کوں سینے پر تے ہلاسے نا۔ اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بہلاسے نا۔ جو کوئی پڑھے گا، جنس جنس کا اثر جھڑے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ اس عہد میں اور بھی کتابیں مثلاً "دلدار طبی نامہ" (سنہ ۱۱۲۹ھ) مصنفہ محمد قادری، "اسرار التوحید" مصنفہ سید شاہ میر وغیرہ لکھی گئیں جن کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں۔ واضح ہو کہ اب تک جس قدر کتابوں کا تذکرہ کیا گیا وہ سب دکنی پیداوار ہیں۔ شمالی ہند میں اس وقت تک سناٹا ہے۔

شمالی ہند میں اوّل تو لوگوں پر شاعری کا رنگ غالب کئے ہوئے تھا۔ دوسرے اُن کے دل و دماغ پر فارسی اس قدر مسلط تھی کہ وہ اُردو میں تصنیف

وتالیف کرنا ننگ وعار سمجھتے تھے۔ تصنیف وتالیف تو ایک طرف مراسلات بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ یہی فارسی اثر تھا کہ اُردو نثر کی طرف لوگوں کی توجہ ہوئی بھی تو قافیہ وسجع کے تکلفات کی قید سے ایک مدت تک آزاد نہ ہو سکے۔

"کربل کتھا" یا "دہ مجلس" | "کربل کتھا" یا "دہ مجلس" شمالی ہند کی پہلی کتاب ہے۔ یہ ۱۲۳۲ھ میں تصنیف ہوئی۔

مصنف شاہ فضل اللہ المتخلص بہ فضلی ہیں۔ یہ کتاب روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔ عبارت اس کی مقفّیٰ ومسجّع اور پیچیدہ ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:—

"اس کا سبب تالیف کا یہ تھا کہ قبلۂ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے نواب مستطاب، معلی القاب اعنی نواب باباام اشرف علی خاں سلمہ اللہ الملک المنّان ہر سال تعزیہ ابو عبد اللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بخلوص نیت اندرونِ محل بوجہ احسن بجا لاتا تھا۔ اور بندۂ حقیر پر تقصیر حسب الارشاد اس قبلہ گاہ کے روضۃ الشہدا کا خلاصہ کہ سبب نکتہ سنجانِ مناقب شاہِ لافتیٰ نے اور سب دقیقہ فہمانِ مصائب سید الشہدا نے واقعہ شہادت کربلا اس میں لکھا ہے سناتا تھا لیکن معنی اِس کے عورتوں کے سمجھ میں نہ آتے تھے۔ اور فقرات پُرسوز وگداز اس کتاب مذکور کے بسبب لغات فارسی اُن کو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف وصد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من وعن ہمیں سمجھا دے اور ہم سی بے سمجھوں کو سمجھا کر رُلاوے۔ مجھ احقر افقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر

ترجمہ اس کتاب کا برنگینیٔ عبارات اور حُسن استعارات ہندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجئے تو ...... بڑا ثواب لیجئے۔"

وہ مجلس کی تالیف کے ایک مدّت بعد سودا نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اُردو نثر میں لکھا جو اُن کے کلّیات میں موجود ہے۔ یہ دیباچہ غالباً ۱۷۶۶ء میں لکھا گیا ہے۔ اِس کی عبارت بہت مشکل اور پیچیدہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"ضمیر منیر پر آئینہ دارانِ معنی کے مُبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیرین سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ دُرِ ریختہ خامۂ دو زباں اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجانِ روزگار کروں تا زبانی اُن اشخاص کی ہمیشہ موردِ تحسین و آفریں رہوں۔ مطلع:۔

قیمت و قدر شناساہی سے پہنچے ہے بہم

ورنہ دریا میں خزف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینے میں بیش از مرغِ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے۔ جس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوشِ دادرس کے۔ غرض جنس اہل سخن کا دُرِ منصفی زینت لب ہے، سر رشتۂ حُسنِ معانی کا اس کلام کے اُس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوسِ دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے۔ ورنہ گزندِ زہر آلود سے بے اجل کا ہے کو مرے۔ ......"

سودا کے مندرجہ بالا دیباچہ سے بائیس سال بعد یعنی ۱۷۸۸ء میں شاہ مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ اور دو سال بعد

یعنی ۱۷۹۰ء میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے بھی قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اِن دونوں ترجموں کی عبارت اگرچہ آسان ہے۔ الفاظ آسان اور عام فہم ہیں لیکن چونکہ لفظی ترجمہ کیا گیا ہے اس لئے الفاظ میں بے ترتیبی اور نشست الفاظ میں ڈھیلاپن پایا جاتا ہے۔ اور اِن عیوب سے عبارت قریب الفہم نہیں رہتی۔ نمونہ ملاحظہ ہو:—

ترجمہ از شاہ عبدالقادر صاحبؒ :— "اے جماعت جنوں اور انسانوں کی! کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے۔ سُناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اُس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ۔ اور اُن کو بہکایا زندگی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔ یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم سے ......"

## تبصرہ

اُردو نثر کا ابتدائی دَور چار سو برس کی طویل مدت میں پھیلا ہوا ہے۔ اس مدت میں تقریباً ساڑھے تین سو برس دکن کے حصے میں آتے ہیں اور پچاس پچپن برس شمالی ہند کے حصے میں۔ اِس دَور کو مذہبی دَور کہا گیا ہے۔ کیونکہ اِس دَور کا تمام و کمال کارنامہ مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ لطف یہ کہ سودا کا دیباچہ جو نہایت مختصر ہے اور کوئی مستقل تصنیف نہیں، مراثی کے دیوان کا دیباچہ ہے، جسے بھی کچھ نہ کچھ مذہبی حیثیت حاصل ہے۔

**زبان** | زبان اِس دَور میں ابتدائی منازل طے کر رہی ہے۔ اگر چہ اِس

وقت تک اُردو نظم کافی ترقی کر چکی ہے۔ اس میں میر و سودا جیسے شاعر اپنے اپنے کمالات دکھا رہے ہیں لیکن نثر ابھی عالمِ طفلی میں ہے۔ دکنی تصانیف میں "سب رس" کو چھوڑ کر باقی تمام تصانیف سادہ اور بے تکلّف عبارت میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس میں دکنی، مرہٹی، تامل وغیرہ الفاظ کی آمیزش اس حد تک ہے کہ اس زمانے میں اُس کا سمجھنا دشوار ہے۔ "سب رس" کی زبان کا بھی یہی حال ہے لیکن اس کی عبارت میں رنگینی ہے۔ قافیہ اور سجع کا التزام کیا گیا ہے۔ اِن تکلّفات سے زبان کی قدامت کے ساتھ ساتھ قدرے پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب شمالی ہند میں آئیے۔ یہاں تین نمونے ملتے ہیں۔ فضلی کے ہاں دکنی اور قدیم الفاظ کے عوض فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ سودا کے یہاں اس کثرت میں اور ترقی ہے۔ لیکن مترجمینِ قرآن کے یہاں نہ قدیم الفاظ ہیں نہ عربی و فارسی الفاظ۔ لیکن زبان خلاف روزمرّہ اور بے ترتیب ہے۔

**طرزِ بیان** | اِس دَور میں نثر عاری بھی لکھی گئی اور نثر مقفیٰ اور مسجّع بھی۔ لیکن طرزِ بیان ہر حالت میں اُکھڑا اُکھڑا سا ہے۔ دکنی اور شمالی ہند کی تصانیف کے اندازِ بیان میں کافی فرق محسوس ہوتا ہے۔ قدیم الفاظ سے قطع نظر کر لی جائے تو "سب رس" کا انداز "دہ مجلس" کے انداز سے صاف اور سلیس ہے۔ یعنی شمالی ہند کا انداز اُلجھا ہوا اور دشوار ہے۔

**نتیجہ** | اِس ابتدائی دَور کو کوئی خاص ادبی اہمیت حاصل نہیں۔

# باب ۱۳

## اُردو نثر کا دوسرا یعنی افسانوی دَور

### سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۳۶ء تک

**تمہید** دَورِ اوّل سنہ ۱۷۹۰ء میں ختم ہوتا ہے اور دوسرے دَور کی ابتدا سنہ ۱۸۰۰ء سے ہوتی ہے۔ اِس دس سال کی مدّت میں ایک ایسی کتاب کا حال معلوم ہوتا ہے جس کو نہ دَورِ اوّل سے کوئی تعلّق ہے اور نہ دَورِ دوم سے۔ اِس لئے خاکسار اُس کا تذکرہ یہاں تمہید میں کئے دیتا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب کا نام "نوطرزِ مرصّع" ہے۔ یہ کتاب حضرت امیر خسرو کی کتاب "چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ مترجم میر محمد عطا حسین خاں تحسینؔ اٹاوہ کے رہنے والے ہیں۔ "نوطرزِ مرصّع" مقبولِ عام نہ ہو سکی۔ اِس لئے اب اُس کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔

**فورٹ ولیم کالج** انگریزوں کو جب ہندوستان کا مستقبل اُمید افزا اور شاندار نظر آنے لگا تو اُنھوں نے اپنی تجارت و سلطنت کو استحکام دینے کے لئے متعدد ذرائع اختیار کئے۔ منجملہ ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ انگریز تجّار و حکّام کو دیسی زبان سکھانے کے لئے فورٹ ولیم میں ایک کالج قائم کیا گیا۔ چونکہ ہندوستانی اور خصوصاً شمالی ہند او پایہ تخت دہلی کی زبان اُردو تھی۔ لہٰذا اُردو کی

تعلیم و تعلّم پر زیادہ زور تھا۔ اُردو کی تعلیم کے لئے کتابوں کی ضرورت تھی۔ مگر یہاں بجز چند دواوین کے اور کیا تھا۔ چنانچہ اسی کالج میں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبہ کے صدر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ تھے۔ فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے اُردو زبان پر جو جو احسانات کئے ہیں اُردو نثر اُن سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ علاوہ متعدد تصانیف و تالیفات کے انھیں ڈاکٹر صاحب کی نظرِ التفات کی وساطت سے اُردو دربارِ سرکار میں رسائی پاکر عدالتی زبان قرار پائی۔

**ڈاکٹر جان گلکرائسٹ** آپ نے شعبۂ تصنیف و تالیف کے صدر ہونے کی حیثیت سے محض مختلف مشہور نثاروں سے کتابیں نہیں لکھوائیں بلکہ خود بھی چند کتابیں لکھیں۔ یوں تو آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں لیکن حسب ذیل زیادہ مشہور اور مفید ہیں۔

۱۔ انگریزی ہندوستانی لغت۔

۲۔ ہندوستانی علم اللسان (فرہنگ)۔

۳۔ ہندوستانی کی صرف و نحو۔

۴۔ اتالیق ہندی۔

۵۔ مکالمہ (یہ کتاب انگریزوں کے لئے تھی تاکہ عام مضامین پر بول چال میں انھیں مہارت حاصل ہو۔)

۶۔ قصص مشرقی (متفرق انگریزی قصّوں کا اُردو ترجمہ ہے) وغیرہ

---

# اس دور کے مشہور نثار اور اُن کی تصانیف

**میر شیر علی افسوس** آپ میر مظفر خاں کے بیٹے تھے۔ جو میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغۂ توپ خانہ تھے۔ افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتداً آپ کے والد نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ لیکن نواب موصوف کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے۔ اس وقت افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ لکھنؤ کی فضا نے بچپن ہی میں شعر و سخن کا شوق پیدا کر دیا۔ میر حیدر علی حیرآن دہلوی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ عربی اور علم حکمت کی تحصیل عالمانہ تھی۔

میر افسوس ابتدا میں نواب سالار جنگ اور اُن کے لڑکے نوازش علی خاں کے پاس گیارہ برس تک رہے۔ پھر مرزا جواں بخت ولی عہد نے جو اُن دنوں لکھنؤ میں رونق افروز تھے، کلام سُن کر از راہِ قدردانی طلب فرمایا اور اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ جب جوان بخت کچھ عرصے کے بعد دہلی جانے لگے تو یہ ہمراہ نہ جا سکے اور نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب آصف الدولہ کے پاس چلے آئے۔

چند سال بعد کرنیل اسکاٹ نے آپ کو کلکتہ بُلایا۔ پانسو روپئے زادِ راہ بھیجے اور دو سو روپئے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ آپ فورٹ ولیم کالج کے سر بر آوردہ لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ آخر ۱۸۰۹ء میں انتقال ہوا۔

دو کتابیں آپ نے یادگار چھوڑیں۔ ایک "باغ اُردو" جو سعدی کی گلستاں کا ترجمہ ہے۔ اور دوسری "آرائشِ محفل" جس میں ہندوستان کے تاریخی حالات درج ہیں۔ افسوس کہ آجکل دونوں کتابیں نایاب ہیں۔

"باغ اُردو" کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ ترجمہ میں اصلی فارسی کی خوبی کو بڑی حد تک قائم رکھا ہے۔ اشعار کا ترجمہ بھی اشعار ہی میں کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

(باب دوم۔گلستاں) ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلاں نے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اُس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ کہا اُس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے۔

جس کو ظاہر میں متّقی دیکھے　　اُس کے تقویٰ کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کا　　محتسب را درونِ خانہ چہ کار

---

**مرزا لطف علی لطف**

مرزا لطف علی نام۔ اور لطف تخلّص تھا۔ آپ کے والد ناظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے۔ نادرشاہ کے ساتھ شاہجہان آباد آئے۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلّص کرتے تھے۔

مرزا لطف کو ڈاکٹر گلکرائسٹ نے کلکتہ بلا کر شعبہ تصنیف و تالیف میں جگہ دی اور تذکرۂ شعراء لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ آپ نے "تذکرۂ گلشن ہند" نامی تذکرہ سنہ ۱۸۰۱ء میں مرتّب کیا۔

تذکرہ کی زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قلفیے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بعض باتیں اس تذکرہ میں ایسی درج ہیں جن کا ذکر کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔ تاریخی حالات بھی خوب درج کئے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس تذکرہ کو شائع کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے جس میں شعراء کے حالات اُردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔

## میر اَمّن دہلوی

میر امان نام اور اَمّن تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے بڑے نامور اور خاندانی شخص تھے۔ فنِ شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ "شاعری میرا پیشہ نہیں ہے۔ نہ میں کسی شاعر کا بھائی۔ میری اُردو ٹکسالی اُردو ہے کیونکہ میں دلّی کا روڑا ہوں اور یہیں کا پرورش یافتہ ہوں۔"

میر اَمّن اور اُن کے بزرگوں کے حالات خود اُنھیں کے زبانی سُنیے اور اِسی بیان کو اُن کی عبارت کا نمونہ سمجھیے۔

"پہلے اپنا حال یہ عاصی میر اَمّن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پُشت بہ پُشت جانفشانی بجالاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے۔ جاگیر منصب اور خدمات کی عنایت سے مالا مال اور نہال کر دیا۔ اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی، زبان مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اُس کے سبب سے آباد تھے یہ نوبت پہنچی۔ ظاہر ہے عیاں راچہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی تباہی اُٹھا کر ایسے شہر سے کہ جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا خدا تھا، غارت ہوا۔ میں بیکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ کئی برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تنِ تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بیکاری میں گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ

نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم کی اتالیقی کے لئے مقرر کیا قریب دوسال کے وہاں رہا جب وہاں اپنا نباہ نہ دیکھا تب منشی میر بہادر علی کے وسیلہ سے حضور جان گلکرائسٹ صاحب بہادر سے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا۔ چاہیئے کہ دن کچھ بھلے آویں، نہیں تو یہی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی بڑے چھوٹے پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔"

میر امّن نے چہار درویش کا قصہ اُردو میں ترجمہ کیا اور "باغ و بہار" اس کا نام رکھا۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں شروع ہوئی اور دوسال کی مدت میں پایۂ اختتام کو پہنچی۔ اِس کے علاوہ "اخلاقِ محسنی" کا بھی اُردو ترجمہ کیا تھا اور "گنج خوبی" نام رکھا تھا لیکن یہ کمیاب ہے۔

میر امّن کی نثر کو وہی رتبہ حاصل ہے جو میر تقی میر کی نظم کو۔ "باغ و بہار" کی تصنیف کو آج ایک سو تینتیس[۱۳] برس سے زیادہ مدت گزری لیکن اب بھی اُس کی وہی قدر ہے جو اُس زمانے میں تھی۔ روانی اور سلاست اور محاورے کی خوبی اور روزمرّہ کی صفائی اس کی خصوصیات ہیں۔ طرزِ بیان بے تکلف اور رواں ہے۔ ہندی الفاظ نہایت خوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں غلط الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی زبان پر یہ الفاظ اِسی طرح رائج تھے۔ عام طور پر عبارت کا رنگ ایسا ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ جذبات کو حفظِ مراتب کے ساتھ بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ کردار نویسی کی بھی کہیں کہیں جھلک موجود ہے۔

**سید حیدر بخش حیدری** دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشوونما پائی۔ سلطنت کی تباہی پر وطن کو خیرباد کہا۔ چندے اِدھر اُدھر سرگرداں و پریشان پھرے۔ آخر قسمت نے انھیں کلکتہ پہنچایا۔ وہاں انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف وتالیف میں ملازمت کرلی۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ آرائش محفل۔ ترجمہ حاتم طائی فارسی۔ ترجمہ لفظ بلفظ نہیں ہے بلکہ جہاں کہیں موقع پایا ہے قصّے کو طول دے دیا ہے۔

۲۔ طوطا کہانی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے قصّے ہیں۔ یہ کتاب پہلے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئی اور فارسی سے حیدری نے اُردو میں ترجمہ کی۔

۳۔ قصّۂ لیلیٰ مجنوں۔ امیر خسرو کی مثنوی کا اُردو ترجمہ ہے۔

۴۔ تاریخ نادری۔ فارسی "نادر نامہ" کا ترجمہ ہے۔

۵۔ گلزار دانش۔ ترجمہ بہار دانش فارسی۔ اس کتاب میں عورتوں کے مکروفریب کے قصّے درج ہیں۔

۶۔ گلِ مغفرت۔ اولیائے کرام اور شہدائے پاک کے حالات درج ہیں۔ سنہ طباعت ۱۸۱۲ء ہے۔

ان سب کتابوں میں "آرائش محفل" یعنی "حاتم طائی" بہت مقبول ہوئی۔ قصّے کے حُسن و قبح کا انحصار پڑھنے والے کی پسند یا عدم پسند پر ہے لیکن اس کی عبارت میر امّن دہلوی کی عبارت کی طرح صاف شستہ اور بامحاورہ ہے۔ زبان آجکل کے مذاق کے مطابق ہے۔ البتہ کہیں کہیں قدامت کی جھلک ہے اور

ہونی بھی چاہیئے کہ آج سے سوا سو برس پہلے کی زبان ہے۔

**نہال چند لاہوری**

اگرچہ دہلی کے رہنے والے تھے مگر ایک عرصہ تک لاہور میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس وجہ سے لاہوری مشہور ہیں۔ افسوس کہ ان کے متعلق اور کچھ دریافت نہیں ہوتا۔ آپ بھی شعبۂ تصنیف و تالیف سے متعلق تھے۔ آپ کی ایک کتاب "مذہب عشق" جس کا دوسرا نام "قصۂ گل بکاؤلی" ہے بہت مشہور ہے۔ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا۔ آپ نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ سن تصنیف ۱۸۰۳ء ہے۔

مندرجہ بالا مصنّفین کے علاوہ چند مصنّفین اور بھی ہیں مثلاً مرزا کاظم علی جوانؔ، مظہر علی خاں ولاؔ وغیرہم لیکن نہ تو اُن کے حالات معلوم ہیں کہ درج ہوں، نہ اُن کی تصانیف و تراجم کا سُراغ ملتا ہے کہ نمونہ پیش ہو۔

یہاں تک جن مصنّفین کا تذکرہ ہوا اُن کا تعلق براہ راست فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے تھا۔ اس کالج اور ان مصنّفین کی خدمات زبان قابل قدر ہیں۔ اِن کی کوششوں سے ملک میں عام طور پر تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اور اہلِ زبان کو نثر نگاری کا سلیقہ آگیا۔ چنانچہ اسی عہد میں سید انشا اللہ خاں انشاؔ نے (حالات ملاحظہ ہوں حصۂ نظم) بھی نثر نگاری کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ آپ کو فورٹ ولیم کالج سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن شعبۂ تصنیف و تالیف نے جو ایک عام مذاق پیدا کر دیا تھا، کچھ اس کا اثر کچھ سید صاحب کی انوکھی طبیعت۔ غرض آپ نے "دریائے لطافت" میں لطافت کے دریا بہائے۔ اِس کتاب میں اُردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ، معانی و بیان وغیرہ کی

بحث ہے۔ پہلا حصّہ یعنی اُردو صرف و نحو تو سیّد صاحب کی تصنیف ہے۔ دوسرا حصّہ جس میں بقیہ مضامین ہیں مرزا محمد احسن قتیل کا تالیف کیا ہوا ہے۔ لیکن کتاب کی جان پہلا ہی حصّہ ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جسے اُردو اہل زبان نے صرف و نحو پر لکھی ہے۔ اس کی زبان اگرچہ فارسی ہے لیکن اس میں جا بجا اُردو عبارت کے نمونے درج ہیں اور چونکہ اُردو صرف و نحو کے متعلق ہے لہذا خاکسار نے اِس جگہ اِس کا ذکر کر دیا ہے۔

" دریائے لطافت کے علاوہ ایک داستان بھی سیّد صاحب کی یادگار ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آنے پایا ہے۔ باوجود اس کے اُردو کے رتبہ سے کلام نہیں گرا ہے۔ یہ داستان کوئی پچاس صفحوں پر مشتمل ہے اور جا بجا ظرافت اور بذلہ سنجی کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ سنہ تصنیف ۱۸۰۳ء ہے۔

## تبصرہ

اُردو نثر نگاری کا دوسرا دور جس قدر مختصر ہے اُسی قدر اُس کے کارنامے وقیع ہیں۔ اگرچہ تمام کتابیں جو اس دور میں تصنیف و تالیف ہوئیں، قصے کہانیوں پر مشتمل ہیں لیکن نثر نگاری کا ذوق پھیلانے میں یہ قصے کہانیاں بے حد مفید ثابت ہوئیں۔ علاوہ بریں چونکہ یہ کتابیں زیادہ تر انگریزوں کے پڑھانے کے لئے لکھوائی گئی تھیں، اِس لئے اِن کا اندازِ بیان نہایت صاف اور سادہ رکھا گیا اور پھر اِسی رنگ کو لوگ پسند کرنے لگے، ورنہ سوداؔ اور فضلی کا رنگ عام ہو کر مدّت تک جاری رہتا۔

# باب ۱۴

## اُردو نثر کا تیسرا یعنی مقفّیٰ و مسجّع دور

### ۱۸۳۶ء سے ۱۹۰۰ء تک

**فقیر محمد خاں گویا**

فقیر محمد خاں نام، گویا تخلّص، حضرت ناسخ کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ زمانۂ شاہی میں آپ رسالہ دار اور حُسام الدولہ کے خطاب سے مخاطب تھے۔

آپ نے حضرت ناسخ اور خواجہ وزیر کے مشورہ سے "انوار سہیلی" کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اُس کا نام "بُستان حکمت" رکھا۔ یہ کتاب ۱۸۳۶ء میں اختتام کو پہنچی۔

اس عہد کی تحریر کے مطابق ترجمہ اچّھا ہے لیکن عربی فارسی الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔ اکثر مقامات پر فارسی اشعار اور عربی ضرب الامثال کو جوں کا توں رہنے دیا ہے جس کی وجہ سے عبارت آسان اور زود فہم نہیں رہی۔ علاوہ بریں بعض الفاظ ثقیل بھی ہیں۔

**مرزا رجب علی بیگ سرور**

مرزا رجب علی بیگ نام، سرور تخلّص، مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے۔ ۱۷۸۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ عربی و فارسی میں کافی مہارت تھی۔

خطاطی اور موسیقی میں بھی دخل تھا۔ شاعری میں آغا نوازش حسین نوازش کے شاگرد ہوئے۔ مذاق سخن ستھرا تھا اور صاحبِ دیوان بھی تھے۔ لیکن شہرت نثر نگاری کی وجہ سے ہوئی۔ واجد علی شاہ نے ازراہ قدردانی پچاس روپیہ ماہوار مقرر کرکے درباری شعراء میں شامل کیا۔ لیکن زوال سلطنت کے بعد بنارس چلے گئے جہاں مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ جی بہت خاطر و مدارات سے پیش آئے۔ آپ نے دہلی، میرٹھ اور راجپوتانہ کی بھی سیاحت کی۔ آخر ۱۸۶۷ء میں بنارس میں انتقال ہوا۔

سرور زندہ دل، شگفتہ مزاج اور یار باش آدمی تھے۔ مرزا غالب سے دوستانہ تعلقات تھے۔

متعدد تصانیف آپ کی یادگار ہیں:۔

۱۔ فسانہ عجائب۔

۲۔ سرور سلطانی (شمشیر خانی کا ترجمہ ہے۔ واجد علی شاہ کی فرمائش سے کیا گیا تھا)۔

۳۔ گلزار سرور۔ (حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ کی فرمائش سے کیا گیا تھا)۔

۴۔ شگوفۂ محبت۔ ایک قصہ ہے۔

۵۔ انشائے سرور۔

جملہ تصانیف میں "فسانۂ عجائب" اپنے رنگ کی بہترین تصنیف ہے۔ یہ افسانہ ۱۸۲۵ء میں لکھا گیا۔ سرور کی جملہ تصانیف کی عبارت کا ایک ہی رنگ ہے یعنی

مقفیٰ و مسجع - یہ رنگینی اور قافیہ پیمائی فارسی کا رنگ تھا لیکن اُردو میں اس رنگ کے سرور ہی موجد ہیں۔ اس قسم کی نثر کی بنا تصنّع اور بناوٹ پر ہوتی ہے اور اُس کی دلاویزی کا مدار مصنوعی حُسن پر ہوتا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ یہ رنگ پُرلطف اور دلکش ہوتا ہے جو کیف و سرور اشعار سے حاصل ہوتا ہے وہی اس قسم کی عبارت سے ملتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرز کا میدان بہت تنگ ہوتا ہے۔ اس زبان میں بجز افسانہ گوئی کسی اور علمی اور ادبی مبحث کی قدرت نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سرور کا طرز نگارش ایک خاص زمانہ تک ہی مقبول رہا۔ اور اس وقت قطعی متروک ہے۔ یہاں تک کہ قصہ کہانی میں بھی اس طرز کو کوئی اختیار نہیں کرتا۔

**مرزا اسد اللہ خاں غالب بہ حیثیت تقریظ نگار**

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۸۔

غالب نے بعض اُردو خطوط اور خاص کر اُردو تقریظوں میں مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خاکسار آپ کا شمار اس دور میں بھی کرتا ہے اور آیندہ دور میں بھی آپ کا شمار کرے گا۔ (ملاحظہ ہو باب ۱۵)

آپ کی تقریظوں اور دیباچوں کا وہی رنگ ہے جو مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصانیف کا۔ لیکن غالب کی عبارت میں تصنع اور آورد نسبتاً کم پائی جاتی ہے۔ عام طور پر دوسرے فقرے میں ویسی ہی بے تکلفی ہوتی ہے جیسی کہ پہلے فقرے میں اور اس سے آپ کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا ہے۔

**مولانا غلام امام شہید**

غلام امام نام۔ شہید تخلص۔ شاہ غلام محمد کے بیٹے

اور قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شہید اچھے شاعر اور مداح نبی اور عاشقِ رسول کے لقب سے مشہور تھے۔ قتیل اور مصحفی کے شاگرد تھے اور علوم متداولہ کی تحصیل مولوی حیدر علی صاحب کی خدمت میں کی تھی۔ فارسی میں کامل دستگاہ تھی اور فارسی نظم و نثر میں آغا سید اسمٰعیل ماژندرانی سے کے شاگرد تھے۔ سرکار نظام سے چارسو تیس روپے سال بلا شرط خدمت مقرر تھے جو آخر وقت تک آپ کو ملتے رہے۔ نواب کلب علی خاں والئ رامپور بھی آپ کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔

شہید نے اپنا کلام کبھی جمع نہیں کیا لیکن جو کچھ محفوظ رہا وہ شائع ہو چکا ہے۔ "مجموعہ میلاد شریف" اور "انشائے بہار بےخزاں" اور قصائد و غزلیات کا ایک مجموعہ آپ کی یادگار ہیں۔

نثر میں آپ کا وہی رنگ ہے جو اس دور کے دیگر انشاپرداز حضرات کا یعنی مقفّٰی و مسجّع لفظ لفظ میں تصنع اور بات بات میں آورد۔ تاج گنج کے روضے کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہے۔

**منشی غلام غوث بیخبر** | غلام غوث نام اور بیخبر تخلص تھا۔ آپ کے والد کا نام خواجہ حضور اللہ تھا۔ آپ کے بزرگوں کا وطن کشمیر تھا۔ خواجہ حضور اللہ ترک وطن کرکے تبت چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال میں آئے اور وہیں اقامت گزیں ہوئے۔ چنانچہ بیخبر وہیں ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔

بیخبر ابھی چار یا پنچ برس ہی کے تھے کہ آپ کے والد نے مجبوراً ترک وطن کیا اور بنارس میں بود و باش اختیار کی۔ آپ نے یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۸۴۰ء میں سلسلۂ ملازمت شروع ہوا۔ اور اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں

میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی کے نائب مقرر ہوئے۔ اور اُن کے انتقال کے بعد خود میر منشی ہو گئے۔ ۱۸۸۵ء میں پنشن لی اور خان بہادر ذوالقدر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں رحلت فرمائی۔

بیخبر اور غالب میں دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ خطوط غالب میں دو خط بیخبر کے نام بھی موجود ہیں۔ آپ کی دو تصنیفیں یادگار ہیں۔ ایک "خونابۂ جگر" اور دوسری "فغانِ بیخبر"۔

بیخبر کا شمار اُس عہد کے نامور انشاپردازوں میں تھا۔ آپ کی عبارت میں رنگینی و تصنع تو ضرور ہے لیکن قوافی اور سجع کا التزام نہیں۔ رعایت لفظی اور مبالغہ کا بہت شوق ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی نثر کو مزین کرتے ہیں۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہو:۔

خط مولانا غلام امام شہید کے نام:۔ "قبلہ میری شوخی دیکھئے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سُناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معانی بیان کر رہا ہوں، چاند کے روبرو نور افشانی کا معما حل کرتا ہوں۔ لعل کے حضور میں رنگ کی دُکان کھولتا ہوں، قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں، مسیحا سے کہتا ہوں جاں بخشی کی روایت سنئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ یدِ بیضا کی چمک دیکھئے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

### امیر مینائی لکھنوی

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۹۔

امیر مینائی نے یوں تو اپنی شاعری سے نظم اُردو کی کافی

خدمت کی ہے لیکن "انتخاب یادگار" کی تالیف سے نثر کی بزم میں بھی آپ کو شرکت کا استحقاق ہے۔ "انتخاب یادگار" اُن شاعروں کا تذکرہ ہے جو ریاست رامپور کے متوسل رہے۔ یہ تذکرہ ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء میں طبع ہوا تھا۔ اس میں چار سو دس شاعروں کا حال قلمبند ہے اور کل ۴۷۵ صفحات ہیں۔

"انتخاب یادگار" کا طرزِ نگارش "فسانۂ عجائب" کی طرح مقفیٰ و مسجّع ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو :۔

"سمندِ قلم پر شہسوارِ سخن کی تاکید ہے کہ میدانِ حمدِ الٰہی میں قدم اٹھا۔ اور تیغِ زبان پر قوتِ ناطقہ کی تہدید ہے کہ اس معرکہ میں جوہر دکھا۔ مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہے۔ نہ اس کا پاؤں نہ اُس کا ہاتھ اُٹھ سکتا ہے۔ اس عجز کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور عقل کو سکتہ ہے ......"

## تبصرہ و کیفیت

دَورِ اوّل میں سادگی تھی، اِس دَور میں تصنّع و آورد ہے۔ دَورِ دوم میں بول چال کا لطف اور روزمرّہ کی صفائی تھی۔ اِس دَور میں قافیہ بندی، تراش خراش، عبارت کی رنگینی اور فارسی کے تتبّع کا زور ہے۔ اس دَور کے مصنّفین اعلیٰ قابلیت کے لوگ ہیں اور فارسی و عربی سے بہرہ وافی رکھتے ہیں۔ نظم کی طرح نثر کو بھی سادگی کے بعد تصنّع کے دَور سے گزرنا پڑا ہے۔ نثر میں بھی نظم کی طرح دہلی اور لکھنؤ اسکول کا فرق موجود ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سادگی کے بعد تصنّع پیدا ہوتا ہے اور تصنّع کے بعد پھر سادگی کی طرف رُجحان ہوتا ہے۔

پہلے دَور کی سادگی مفید تھی لیکن اس دَور کا تکلّف کسی اہم کام کے لئے موزوں نہیں اور یہی وجہ ہے کہ رنگ عام نہیں ہوسکا۔ خاکسار نے ایک خاص رنگ کے مصنّفین چُن کر ایک دَور قائم کر دیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دَور دوم کی سادگی دَور سوم میں کیا موجودہ زمانے تک کارفرما ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دَور دوم مفید اور کارآمد تصانیف و تالیفات سے قطعی خالی ہے۔ جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں آپ نے اُن کتابوں کی فہرست دی ہے جو انڈیا آفس لندن میں آپ کی نظر سے گزری۔ یہ فہرست ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس میں شامل نہیں۔ اِس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اُردو غدر کے پہلے ہی سے علمی زبان بن رہی تھی۔ کتابوں کی کثرت کا اِس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فہرست کتب تین سو صفحات میں ختم ہوئی ہے۔ اس فہرست میں علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الٰہیات وغیرہ کی بے شمار کتب درج ہیں۔

---

# باب ۱۵

## اُردو نثر کا چوتھا یعنی ادبی، تاریخی اور تنقیدی دور

### ۱۸۵۰ء سے ۱۹۳۶ء تک

**تمہید** اس سے قبل اُردو نثر تین ادوار سے گزر چکی ہے۔ ابتدائی دور محض تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔ تیسرا دور نثر کی ترقی کی زنجیر کی کوئی اہم کڑی نہیں۔ البتہ دوسرا دور ایسا ہے جس نے چوتھے دور کے لئے میدان صاف وہموار کرکے سہولتیں مہیا کردی تھیں۔ واضح ہو کہ تیسرے دور کا درمیانی زمانہ اور چوتھے دور کا ابتدائی زمانہ دوش بدوش چلتا نظر آتا ہے۔ تیسرے دور میں جہاں مقفٰی اور مسجع عبارتیں لکھی جارہی ہیں وہاں چوتھے دور میں غالب کے خطوط اور سرسید احمد خاں کے علمی مضامین دنیائے ادب میں گلکاریاں کررہے ہیں۔ مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ چوتھے دور کی تدریجی ترقی کا تعلق تیسرے سے نہیں بلکہ دوسرے دور سے ہے۔ چوتھے دور کی ابتدا ابن غالب کے خطوط ملتے ہیں۔ اُن کا تعلق نہ دوسرے دور سے ہے اور نہ چوتھے دور سے۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تذکرہ یہاں تمہید میں کردیا جائے۔

**غالب کے خطوط** غالب کے حالات زندگی اور اُن کی تقاریظ کے لئے ملاحظہ ہوں ابواب ۸ اور ۱۴۔

مرزا غالب سنہ ۱۸۵۰ء تک خط و کتابت ہمیشہ فارسی میں کرتے تھے لیکن سنہ مذکورہ میں آپ ہمہ تن "مہر نیم روز" لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اُس وقت اُن کو خط و کتابت بضرورت اُردو میں کرنی پڑی۔ آپ فارسی خطوط نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی" اور پھر "مہر نیم روز" کی مصروفیت" غرض یہ کہ آپ نے خط و کتابت اُردو میں شروع کر دی۔

آپ کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک "اُردوے معلیٰ" دوسرا "عود ہندی"

خطوط کی عبارت صاف، سادہ، سلیس، رواں اور بے تکلف ہے۔ خط و کتابت کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ آپ نے قطعی ترک کر دیا۔ آپ خط کو کبھی "میاں"، کبھی "برخوردار"، کبھی "بھائی صاحب" کبھی "مہاراج" کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اُس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اکثر بغیر کسی قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدّعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال جواب کرتے ہیں۔ بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں۔ اِن سب خصوصیات کے علاوہ آپ کے خطوط میں لطف بیان اس بلا کا ہے کہ اُن میں ناول اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپی ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی نہایت خوشگوار حد تک تھی۔ لہٰذا اُن کے خطوط میں بھی بے جا

شوخیانہ انداز پایا جاتا ہے۔ آپ خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رُتبہ کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔

---

# حصہ اوّل

## بانی تہذیب الاخلاق۔ اور تہذیب الاخلاق کا اثر

**سر سید احمد خاں**

حالی نے سر سید کے سوانح حیات پر ایک ضخیم کتاب موسومہ "حیات جاوید" تصنیف کی ہے جو بڑی دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ خاکسار یہاں نہایت اختصار کے ساتھ سر سید کے حالاتِ زندگی پیش کرتا ہے۔

سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ حسینی سید تھے۔ آپ کے آبا و اجداد شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے اور اُسی وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانہ تک شاہانِ مغلیہ کی مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ اکبر شاہ ثانی نے سر سید کے والد میر متقی کو عہدۂ وزارت کے لئے نامزد کیا مگر انھوں نے اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انکار کر دیا۔

سر سید کی ابتدائی تعلیم و تربیت اُن کی والدہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ ۱۸۳۸ء میں میر متقی کا انتقال ہو گیا تو سر سید کو ملازمت کا خیال پیدا ہوا۔ کچھ دنوں تک



سر سید احمد خاں

عدالتی کارروائی سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد صدر امینی میں سررشتہ داری مل گئی۔ لیکن اپنی ذاتی قابلیت و صلاحیت کی بدولت ترقی کرتے کرتے صدر امین کے عہدے تک پہنچ گئے۔

دورانِ ملازمت میں علم کا ذوق برابر کام کرتا رہا۔ چنانچہ دہلی کی منصفی کے زمانے میں آپ نے دہلی کی عمارات کے متعلق تحقیقات کی اور اپنی کاوش اور جستجو کے نتیجے کو "آثار الصنادید" نامی کتاب کی شکل میں پیش کیا جو بڑی مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ دورانِ قیام دہلی ہی میں اور بھی چند رسالے آپ نے تصنیف کئے جو زیادہ تر مذہبی مبحث پر ہیں۔

۱۸۵۵ء میں آپ مراد آباد تبدیل ہوئے۔ وہاں آپ نے تاریخ "سرکشی بجنور" شائع کی۔ اس میں مئی ۵۷ء سے لے کر اپریل ۵۸ء تک کے حالات و واقعاتِ غدر جو ضلع بجنور میں گزرے تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

آپ نے ایک انگریزی اسکول مراد آباد میں اور دوسرا غازی پور میں کھولا اور غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون سے بیداری پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور انجمن انھوں نے قائم کی جس کا نام برٹش انڈیا ایسوسی ایشن تھا۔

۱۸۶۴ء میں آپ غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آئے۔ اور سائنٹفک سوسائٹی کو بھی وہیں منتقل کر لیا۔ ۱۸۶۶ء میں آپ نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے آخر دم تک جاری رہا۔ اس اخبار میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی مضامین چھپتے تھے۔ اور یہ مضامین زیادہ تر

سرسید ہی کے ہوتے تھے۔

سرسید کو ابتدا ہی سے مسلمانوں کی اصلاح کی دُھن تھی۔ اور اُن میں تعلیم پھیلانے کا شوق تھا۔ لہذا آپ اصول وطرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ سال بھر کے بعد واپس آئے۔ اُنھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ چنانچہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا پہلا نمبر شائع ہوا اور پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا۔

جولائی ۱۸۷۶ء میں آپ نے پنشن لی اور ملازمت سے کنارہ کش ہوکر آپ علی گڑھ چلے آئے۔ اور علی گڑھ کالج کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آخر ۱۸۷۸ء میں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ کالج ترقی کرتا کرتا آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔

سرسید کو آخر وقت تک قومی خدمات کی دُھن اور کالج کی بہبودی کا خیال رہا۔ آخر ۱۸۹۸ء میں اس محسنِ قوم نے جہان فانی سے کوچ کیا۔ سرسید نے قوم کی بہبودی کے لئے جو جو کام کئے اُن کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں۔ البتہ جو احسانات آپ نے اُردو زبان پر کئے ہیں اُن سے سروکار ہے۔ آپ کی تصانیف کی فہرست کافی لمبی چوڑی ہے جن میں سے دوچار کے نام اوپر گزر چکے ہیں لیکن مہتم بالشان خدمت جو آپ نے اُردو زبان کی کی اُس کا ذریعہ "تہذیب الاخلاق" ہے۔ آپ خود اُس کے اڈیٹر اور منیجر تھے اور زیادہ تر خود ہی مضامین لکھا کرتے تھے۔ دیگر مضمون نگاروں میں مولوی سید مہدی علی خاں اور مولوی چراغ علی خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔

سرسیّد کی عبارت صنائع وبدائع اور تکلّفات باردہ سے یکسر پاک ہوتی ہے۔ جس بات کو لکھتے ہیں قلم برداشتہ، لیکن اُسے دلائل وبراہین سے مضبوط کرتے جاتے ہیں۔ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مبحث پر جب قلم اُٹھاتے ہیں تو اُسے سادگی اور صفائی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ الفاظ سیدھے سادے مگر زوردار۔ اگر کوئی غلط یا متروک لفظ اُن کے مفہوم کو بہتر طریقہ پر ادا کرتا ہے تو اُسے بے تکلّف استعمال کرتے ہیں۔ اصول اور قواعد کی پابندی اگر ادائے مطلب میں مانع آتی ہے تو اُس سے سبکدوش ہونے میں جھجکی نہیں سمجھتے۔ بعض اصحاب اس خصوصیت کو عیب سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ بجز اس کے چارہ ہی کیا تھا۔ زبان اظہار مطالب کے لئے ہے۔ اگر اصول وقواعد اس مقصد کے حصول میں مانع ہوں تو اُن کی پابندی کیونکر کی جاسکتی ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سرسیّد کا طرز کہیں کہیں خشک اور بے لطف ہوگیا ہے۔ لیکن اس خشکی اور بے لطفی کی ذمہ دار زیادہ تر نوعیت مطالب ہے۔ ناول یا افسانہ میں اس قسم کی خشکی ناقابل عفو سہی لیکن علمی اور فلسفیانہ مضامین میں یہ خشکی اکثر ناگزیر ہوتی ہے۔ آخر میں یہ بھی عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ "تہذیب الاخلاق" نے اُردو زبان کی خدمات کیونکر انجام دیں۔ اوّل تو اُس نے اُردو میں علمی، ادبی، مذہبی وغیرہ مضامین کا ایک وافر ذخیرہ جمع کردیا۔ دوسرے اس کے مضمون نگاروں نے بھی اُسی رنگ کے مضامین لکھے اور اس طرح ملک میں ایک جماعت، علمی، مذہبی، سماجی وغیرہ مضامین لکھنے والوں کی پیدا ہوگئی۔ تیسری اور سب سے زیادہ

اہم بات یہ ہے کہ چونکہ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل انوکھے ہوتے تھے، اس لئے ملک میں ایک بڑی جماعت اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ یہ لوگ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین کا رد لکھتے تھے اور اپنے جواب کو ہر صورت سے اصل مضمون کا جواب بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح ان جوابی مضامین میں سرسید کا طرز نگارش بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیس اور عام فہم اُردو نثر کا ملک میں چرچا ہو گیا۔

## نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

آپ کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ آپ کے جد امجد کشمیر سے پنجاب اور پھر پنجاب سے میرٹھ آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ کے والد مولوی محمد بخش سہارنپور میں کلکٹر کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ لیکن جب انگریزوں کا تسلط پنجاب پر ہو گیا تو آپ محکمہ بندوبست میں منتقل ہو کر ترقی کرتے کرتے مہتمم بندوبست ہو گئے۔ افسوس کہ آپ اپنی اولاد کو خاطر خواہ تعلیم نہ دلا سکے اور عین عالم جوانی میں ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا۔ اُس وقت مولوی چراغ علی کی عمر بارہ برس کی تھی۔

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی۔ اور سوائے معمولی اُردو، فارسی، انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل تھی اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے تھے کہ ضلع بستی (کمشنری گورکھپور) میں خزانے کی منشی گری پر جس کی تنخواہ بیس روپے تھی آپ کا تقرر ہو گیا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا سے تھا۔ سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت

لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب "تاریخ محمدی" کے جواب میں آپ کا رسالہ "تعلیقات" اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "منشور محمدی"۔ "مخبر صادق" لکھنؤ وغیرہ میں بھی آپ کے اکثر مضامین شائع ہوئے۔

مولوی صاحب اپنی ذاتی قابلیت کی مدد سے منشی گری سے ترقی کر کے ڈپٹی منصرمی تک پہنچے۔ اور پھر تحصیلدار ہو گئے۔ مذہبی مباحث اور مضمون نویسی کی وجہ سے سرسید احمد خاں سے تعارف ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُن کی سعی سے آپ حیدر آباد میں مددگار معتمد مالگذاری کے عہدے پر مقرر ہوئے اور چار سو روپیہ ماہوار آپ کی تنخواہ مقرر ہوئی۔ وہاں بھی آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے فرائض کو انجام دیا اور ترقی کر کے معتمد مال کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آخر ۱۸۹۵ء میں آپ نے انتقال فرمایا۔

مولوی چراغ علی متعدد علوم اور متعدد زبانوں کے عالم تھے۔ سرسید اُن کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں۔ "متعدد علوم میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی زبان اور عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی اُنھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔"

آپ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر اور ایک زبردست مصنف تھے۔ اُن کی تمام تصانیف اسلام کی حمایت میں ہیں۔

اُن کی عبارت میں لفاظی اور عبارت آرائی مطلق نہیں ہوتی۔ اور نہ اُنھیں فصاحت وبلاغت کے قواعد کی پروا ہوتی ہے۔ مضامین کو دلائل سے مضبوط کرتے ہیں اور مطلب سے مطلب رکھتے ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں سے نہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں نہ پڑھنے والے کا۔ "تہذیب الاخلاق" میں اکثر آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

---

## نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں

میر مہدی علی نام۔ خلف الرشید میر ضامن علی ۹ر دسمبر ۱۸۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سادات بارہہ کے ایک خاندان سے تھا جو اٹاوہ میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔

میر مہدی علی نے عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم اٹاوہ ہی میں حاصل کی۔ اور دس روپئے ماہوار پر کلکٹری میں ملازم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے اہلمدی اور سر رشتہ داری کے مدارج طے کرتے ہوئے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے۔ اور ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

دورانِ ملازمت میں لکھنے پڑھنے کا شوق دامنگیر تھا۔ چنانچہ "آیات بیّنات" نامی ایک مذہبی کتاب لکھکر شائع کی۔ اُسی زمانہ میں سرسید سے شناسائی ہوئی۔ اور یہ شناسائی آگے چل کر دوستی کے تعلقات میں نمودار ہوئی۔

۱۸۷۴ء میں ریاست حیدرآباد نے آپ کو طلب کیا اور انسپکٹر جنرل مالیات کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے آپ معتمد مال ہو گئے اور

تین ہزار روپئے ماہوار آپ کی تنخواہ ہوگئی۔ حُسن خدمات پر ریاست کی طرف سے محسن الدولہ، محسن الملک، منیر نواز جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں پنشن لے کر آپ علی گڑھ چلے آئے اور بقیہ عمر قومی خدمت اور کالج کے انتظام میں صرف کی چنانچہ سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سکریٹری بھی ہوگئے۔ آخر ۱۹۰۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ مضامین تہذیب الاخلاق۔ ۲۔ مکمل مجموعہ لکچر۔ ۳۔ تقلید عمل بالحدیث۔
۴۔ مکاتیب۔ ۵۔ مسلمانوں کی تہذیب۔ ۶۔ آیات بیّنات۔
۷۔ کتاب المحبّت والشوق۔

نواب محسن الملک اعلیٰ درجہ کے مقرر اور شیریں زبان تھے۔ برجستہ تقریر کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق میں آپ کے اکثر مضامین شائع ہوئے ہیں۔ آپ کو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ آپ کی عبارت صاف اور شستہ ہوتی ہے۔ انداز تحریر قابل تعریف ہے۔ منطقی استدلال اور تحقیق و تدقیق کا مادّہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ سرسیّد کے مقلّد ہیں لیکن پھر بھی آپ کی عبارت میں جدّت پسندی پائی جاتی ہے۔ صفائی اور سلاست پر کہیں کہیں صنائع و بدائع کی رنگینی، عبارت میں دلکشی و شگفتگی پیدا کردیتی ہے۔ عام طور پر انداز بیان میں زور اور عبارت میں توازن پایا جاتا ہے۔

---

# حصہ دوم

## شموس ستّہ

**شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد**

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۱۰۔

مولانا آزاد کی انشا پردازی مسلّم الثبوت ہے۔ آپ نے اپنی بیش بہا تصانیف اور بے مثل طرز نگارش سے جو احسانات زبان اُردو پر کیے ہیں اُن کا کما حقّہٗ اظہار بہت دشوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا مرتبہ محسنین زبان اُردو میں بہت بلند ہے۔

آپ کے تبحّر علمی اور طبیعت کی ہمہ گیری نے مختلف موضوع پر قلم اُٹھایا۔ تاریخ ادب سے اُردو کو روشناس کیا، تنقید کی بھی ابتدا کی۔ علم اللسان کے متعلق تحقیقات کی، تاریخ لکھی، انگریزی تمثیلی افسانوں سے اُردو کو مالا مال کیا۔ غرض یہ کہ اُردو کو وسعت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اُردو قاعدے، قواعد اُردو، قصص ہند وغیرہ کے علاوہ مولانا کی مندرجہ ذیل تصنیفات پر اُردو زبان و ادب کو فخر ہے:۔

۱۔ آب حیات، (اُردو شعر و سخن کی تاریخ ہے۔ شعراء کے کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے)۔

۲۔ نیرنگ خیال (انگریزی تمثیلی افسانوں کی جنہیں "ایلی گری" (Allegory) کہتے ہیں، تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس میں متعدد مضامین ہیں)۔

۳۔ دربارِ اکبری، (شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے)۔

۴۔ سخندانِ پارس، (علم السنہ یعنی فیلالوجی پر ہے)۔

۵۔ دیوانِ ذوقؔ، (حضرت ذوقؔ کے منتشر کلام کو یکجا کر کے جستہ جستہ حالات کے ساتھ مرتّب کیا ہے)۔

مولانا آزاد کا طرزِ تحریر دَورِ سوم اور دَورِ چہارم کے مصنّفین کے طرزِ تحریر کے درمیان ایک اعتدال کی مثال ہے۔ نہ تو وہ اس قدر رنگین ہے کہ تصنّع اور آورد کا عیب آنے پائے اور نہ اس قدر بھاری کہ خشکی اور بے لطفی کی شکایت ہونے پائے۔ مولانا کے طرزِ تحریر کی بنیاد شیرینیٔ زبان، صحت محاورہ اور دلکشیٔ تشبیہ و استعارہ پر ہے۔ عبارت میں سادگی اور بے تکلّفی سے ایک حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا کے قلم میں وہ جادو ہے کہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں اُس کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ جذبات نگاری پر وہ قدرت ہے کہ جب چاہیں پڑھنے والوں کو ہنسا دیں جب چاہیں رُلا دیں۔ بیان میں وہ زور ہے کہ جو بات پڑھنے والوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ کی نثر میں نظم کا لطف ہے اور آپ کے جملوں میں شعر کا سا اثر ہے۔

"آبِ حیات" اور "دربارِ اکبری" انشا پردازی کے لحاظ سے آپ کی بہترین تصانیف ہیں۔ جن میں ناول سے زیادہ لطف اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپی ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دونوں کتابوں میں تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ ہوئی اَن ہوئی باتوں کو محض طرزِ ادا کے جادو سے چمکا دیا ہے۔ اس اعتراض میں ایک حد تک صداقت بھی ہے۔ لیکن اِن دونوں کتابوں کے مفید

اور کار آمد ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یقین ہے کہ یہی دونوں کارنامے مولانا کی حیات جاوداں کے سبب بنیں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا طرز جس قدر دلچسپ ہے اُسی قدر ناقابل تقلید بھی ہے۔ اکثر اُن کے طرز کی تقلید کی گئی لیکن بجز ناکامی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن اس طرز میں ایک خامی بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ طرز محض قصّہ کہانیوں اور افسانوں ہی کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ علمی، فلسفی و تاریخی وغیرہ مطالب کے لئے یہ طرز اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس قسم کے مطالب اس میں ادا کئے جاسکیں۔

---

## شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں

مولوی ذکاء اللہ خاں ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ ثناء اللہ نہایت دیندار اور پابند صوم صلوٰۃ بزرگ تھے۔ مولوی ذکاء اللہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہوئے اس کے بعد آپ آگرہ کالج میں معلم اُردو ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۵۵ء میں آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر اضلاع بلند شہر و مراد آباد میں رہے اور گیارہ سال تک اس عہدہ پر مستعدی سے کام کرتے رہے۔

۱۸۶۹ء میں آپ میور کالج الہ آباد کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جہاں پندرہ سال تک ایم۔اے تک کی کلاسوں کو عربی و فارسی پڑھاتے رہے۔ آخر



مولانا ذکاء اللہ دہلوی

۴۶ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد آپ نے پنشن لی اور چوبیس سال تک آپ بفراغت تمام تصنیف وتالیف میں منہمک رہے۔ آخر ۱۹۱۰ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

مولوی ذکار اللہ نے اُردو زبان کی جو خدمات کی ہیں وہ ہمیشہ قابل تحسین وتشکّر رہیں گی۔ ریاضیات، تاریخ وجغرافیہ، علم ادب، علم اخلاق، طبیعیات و ہیئت اور سیاست مدن وغیرہ علوم پر آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۴۴ تک پہنچی ہے۔ اِن مستقل تصانیف کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعوں پر مضامین لکھتے رہتے تھے جو ملکی رسائل واخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اگر ان تمام مضامین کو یکجا کیا جائے تو یہ مجموعہ کئی ضخیم جلدوں کے برابر نکلے گا۔ ان مضامین میں تاریخ، فلسفہ، سائنس، کیمیا، طرزِ معاشرت، علم المعیشت، سیاست۔ غرض مشکل سے کوئی مضمون بچا ہوگا جس پر آپ نے طبع آزمائی نہ فرمائی ہو۔ کثرت تصانیف کے لحاظ سے اُردو کا کوئی مصنّف آپ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کا طرزِ نگارش سلیس، رواں اور بے تکلّف ہے۔ بڑے سے بڑے حال کو نہایت مختصر عبارت میں لکھ دیتے ہیں اور مشکل سے مشکل بات کو چند الفاظ میں سُلجھا دیتے ہیں۔ آپ کی تصانیف ملک میں بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ نے بھی حُسنِ خدمات کے صلے میں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات عطا فرمائے۔ اور پندرہ سو کا ایک انعام بھی دیا۔

آپ کا طرزِ تحریر کسی قدر روکھا پھیکا ہے یعنی اس میں شگفتگی اور دلکشی نہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جن موضوعوں پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے اُن میں شگفتگی

اور دلکشی کا زیادہ امکان بھی نہیں۔

---

## ۳۔ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی

مولوی سید علی قصبۂ بلگرام کے ایک شریف خاندان سے تھے۔ آپ کے والد زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر مامور رہے۔ ۱۸۷۵ء میں پنشن لینے کے بعد حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر ممتاز ہو گئے تھے۔ مولوی سید علی اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ آپ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر تک عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسہ میں داخل ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔ اے میں اُن کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ کالج کے پروفیسر آپ کی ذہانت، قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔

مولوی صاحب کی قابلیت اور روز افزوں ترقی کو دیکھ کر سر سالار جنگ بہادر نے آپ کو حیدر آباد طلب فرمایا۔ اور اپنے خاص عملے میں داخل کیا۔ حیدر آباد پہنچ کر آپ نے علم طبقات الارض، کیمیا، طبیعیات، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیوٰۃ وغیرہ علوم میں دستگاہ حاصل کی۔ تکمیل علوم کے لئے آپ ولایت بھی تشریف لے گئے۔ چنانچہ فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا۔

مولوی صاحب مختلف زبانیں لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی

خوب جانتے تھے۔

سنہ ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ نے انہیں شمس العلماء کا خطاب عطا فرمایا سنہ ۱۹۰۱ء میں آپ انگلستان جاکر مقیم ہوئے اور سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرر مقرّر ہوئے۔

آخر عمر میں ہر دوئی میں قیام کر لیا تھا اور قوم کی خدمت میں وقت صرف کرنے لگے تھے۔ آخر سنہ ۱۹۱۱ء میں اِس دنیا سے کنارہ کش ہوئے۔

مولوی صاحب کے کارنامے زیادہ تر ترجمے ہیں جن میں "تمدّن ہند" اور "تمدّن عرب" نے آپ کے نام نامی کو خوب روشن کیا۔ یہ دونوں کتابیں موسیو لیبان کی تصنیف کردہ اور فرانسیسی زبان میں ہیں۔ آپ نے ان کا اُردو ترجمہ کیا اور اِس قابلیت سے کیا کہ خاص آپ ہی کی تصانیف معلوم ہوتی ہیں۔ آپ نے اُردو ترجمے میں شاذ و نادر ہی کہیں انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اصطلاحات کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔ زبان پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے۔ روزمرّہ و محاورہ کا جائز صرف خوبی سے ہوتا ہے۔ عبارت میں سلاست اور روانی بدرجۂ احسن موجود ہے۔

---

| ۴۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد | حالات زندگی اور ادبی خدمات کے لئے آیندہ باب ملاحظہ ہو۔ |
|---|---|

نوٹ۔ اگرچہ مولوی نذیر احمد صاحب کا تذکرہ یہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن خاکسار نے اپنے ذہن میں جو تاریخ ادب کا خاکہ بنا رکھا ہے اُس کی رو

سے آپ کا شمار ناول نگار حضرات کی انجمن میں بہ حیثیت صدر کے ہوگا۔ ناچیز نے آپ کے نام نامی کو اس دور کے شموس میں شمار تو کر ہی لیا ہے۔ اب تذکرہ خواہ کہیں ہو۔ انتقال مقام سے خدانخواستہ رتبہ میں کچھ کمی واقع نہ ہوگی۔)

**۵۔ شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی**

حالات زندگی اور آپ کی شاعری کے متعلق ملاحظہ ہو باب ۱۰۔

مندرجہ ذیل تصنیفات نثر آپ کی زندۂ جاوید ہیں۔

۱۔ حیاتِ سعدی۔ (شیخ سعدی کی سوانح عمری اور اُن کی نظم و نثر پر تبصرہ ہے۔)

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ (شاعری پر ایک مبسوط مضمون ہے جو دیوانِ حالی کے مقدمے کے طور پر شائع ہوا۔)

۳۔ یادگارِ غالب۔ (اسد اللہ خاں غالب کی سوانح عمری اور اُن کی فارسی اور اُردو نظم و نثر پر تنقید ہے)۔

۴۔ حیاتِ جاوید۔ (سر سید احمد خاں کی سوانح عمری ہے)

ان کے علاوہ متفرق مضامین ہیں جو تہذیب الاخلاق وغیرہ رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم نے اُن مضامین کو یکجا کر کے ۱۸۹۴ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا تھا۔

"مکتوباتِ حالی" دو جلدوں میں اُن کے صاحبزادہ خواجہ سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۵ء میں ترتیب دے کر چھپوائے۔

مولانا حالی نے اُردو کو سوانح عمری سے روشناس کیا۔ آپ کی تصانیف

حیاتِ سعدی و حیاتِ جاوید وغیرہ سے قبل اُردو میں کوئی سوانح عمری موجود نہیں تھی۔ علاوہ ازیں "مقدمۂ شعر و شاعری" اور "یادگارِ غالب" کے بعض مقامات سے اُردو میں حقیقی اور بے لوث تنقید کا اضافہ کیا۔

مولانا کی سوانح نگاری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ نے تصویر کا ایک رُخ دکھایا ہے۔ معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا توجیہ کر دی گئی ہے۔ اگرچہ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن اوّل تو جو محبت اور عقیدتمندی مولانا کو سرسیّد اور غالب سے تھی اُس کا تقاضا بھی تھا کہ اُن کے عیب، ہُنر نظر آئیں یا عیب سرے سے نظر ہی نہ آئیں۔ دوسرے سوانح عمری کا کوئی نمونہ زبانِ اُردو میں موجود نہیں تھا جو مولانا کے لئے چراغِ ہدایت بنتا۔

مولانا کی انشاپردازی مسلّم ہے۔ آپ کی نثر میں سادگی، سلاست اور صفائی بدرجۂ احسن موجود ہے۔ تصنّع اور آورد کا کہیں نام نہیں بلکہ ہر مقام پر برجستگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جس مضمون کو ادا کرتے ہیں نہایت سادہ عبارت میں تحریر کرتے ہیں۔ خیالات کا تسلسل اور زبان کی پختگی خود بخود دل پر اثر کرتی ہے۔ زبان ٹکسالی ہے اور محاورات کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں ہیں لیکن عبارت میں شگفتگی نہیں۔ انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ایسے لفظ بھی استعمال کئے ہیں جن کا مترادف اُردو پیش کر سکتی تھی۔

---

۱۴۔ **شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی**

مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام بندول ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ صاحب سے حاصل کی اور پھر مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے عربی کی تحصیل کی۔ اور معقولات و منقولات کی تعلیم کے لئے رامپور، سہارنپور، لکھنؤ، لاہور وغیرہ مقامات کی سیاحت کرتے رہے۔ اُنیس سال کی عمر میں یعنی ۱۸۷۶ء میں حجاز کا سفر کیا اور فریضۂ حج ادا کیا۔ اور مدینۂ منورہ کے کتب خانہ سے فیض اُٹھایا۔

مولانا فطری شاعر تھے۔ اس فن میں کسی کی شاگردی نہیں کی۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ قیام اعظم گڑھ کے زمانے میں وہاں جو مشاعرے ہوتے تھے تو آپ میر مشاعرہ بنائے جاتے تھے۔

گھر والوں نے زمینداری کا جُوا آپ کے کندھوں پر رکھنا چاہا لیکن مولانا اس بے کیف شغل سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ آخر میں یہ رائے ہوئی کہ آپ وکالت کریں۔ چنانچہ آپ نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اور چند ماہ اعظم گڑھ میں وکالت کی۔ لیکن یہ پیشہ بھی آپ کی اُفتادِ طبع کے خلاف تھا۔ چنانچہ وکالت ترک کر کے آپ امین دیوانی ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی جی نہ لگا۔ آخر مستعفی ہو کر مطالعہ و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

مولانا کے ایک نوجوان بھائی مہدی علی گڑھ کالج میں تعلیم پاتے تھے ۱۸۸۲ء میں آپ اُن سے ملنے گئے وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی۔



شبلي نعمانی

سرسید نے اس جوہر قابل کو پرکھا اور اُسی کالج میں فارسی و عربی کا پروفیسر مقرر کردیا۔ اُس زمانے میں آپ نے سرسید کے کتب خانہ سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ اور اُسی زمانے میں آپ نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ فرمائی۔ اور سب سے پہلے "المامون" تصنیف کی۔ اُس کے بعد "سیرۃ النعمان" لکھی اور پھر مصر و شام و روم کا سفر کیا۔ اس سفر میں آپ نے "الفاروق" کے لئے کافی مسالا جمع کیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں سولہ سال کی خدمت کے بعد کالج کی پروفیسری سے استعفا دیدیا اور اعظم گڑھ میں مستقل قیام کرکے تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی نے آپ کو حیدرآباد بلایا۔ وہاں آپ کو نظامتِ علوم و فنون کا عہدہ مل گیا۔ حیدرآباد ہی کے قیام میں آپ نے "الغزالی"، "سوانح رومی"، "علم الکلام"، "الکلام" اور "موازنہ انیس و دبیر" بالترتیب تصنیف فرما کر شائع کیں۔

ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی بہبودی اور فلاح کی تدابیر کی جائیں لیکن چونکہ مسلمانوں کی اصلاح علماء کی اصلاح پر مبنی ہے۔ لہٰذا علماء کی اصلاح اور صحیح طریقہ پر تعلیم دینے کے لئے یہ دارالعلوم قائم کیا گیا۔ مولوی محمد علی کانپوری اس کے روح رواں تھے۔ اُن کے استعفا دینے پر اُس کی حالت خراب ہونے لگی۔ مولانا شبلی خود لکھنؤ پہنچے اور ۱۹۰۴ء میں اس دارالعلوم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹۱۴ء تک نہایت خیر و خوبی کے ساتھ اُسے چلاتے رہے۔ آخر حاسدین کی رخنہ اندازیوں سے بددل ہوکر اُس کی خدمات

سے سبکدوش ہو گئے۔

لکھنؤ سے واپس آ کر آپ نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں اچھے مصنفین کی ایک جماعت پیدا ہو جائے۔

یہ دارالمصنفین نہایت آب و تاب کے ساتھ مذہب و علم کی خدمت کر رہا ہے۔

مولانا کی جو شہرت ہندوستان اور ممالک غیر میں ہوئی اُس کا اندازہ اِس سے ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغۂ مجیدی آپ کو عنایت کیا۔ ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ نے دیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" کے ممبر بھی اُسی زمانے میں ہوئے۔ نظام دکن نے سو روپئے ماہوار مقرر کئے۔ پھر ۱۹۱۲ء میں تین سو روپئے ماہوار کر دیئے۔ انگلستان کے مشہور مشرق شناس پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ "ادبیات فارسی" کی چوتھی جلد میں مولانا کی شعرالعجم سے مستفید و مستفیض ہونا فخر کے ساتھ بیان کیا۔

سب سے آخری اور اہم تصنیف سیرۃ نبوی زیر تالیف تھی۔ کچھ اجزاء تیار ہو چکے تھے کچھ باقی تھے کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی اور ملک اور قوم اِس محسن علم و ادب سے ساری عمر کے لئے محروم ہو گئی۔

تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے مولانا شبلی مولانا ذکاءاللہ کو چھوڑ کر بقیہ اپنے ہم عصر شموس سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ یوں تو آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں لیکن زیادہ مشہور یہ ہیں۔

المامون۔ سیرۃ النعمان۔ الفاروق۔ سفرنامہ۔ الغزالی۔ علم الکلام۔

سوانح مولانا روم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ شعر العجم۔ سیرۃ النبی۔ الکلام۔
مولانا کی جملہ تصنیفات پانچ مستقل شاخوں پر تقسیم ہو سکتی ہیں۔

(۱) علم الکلام، (علم الکلام، الکلام)

(۲) تاریخ، (المامون۔ الفاروق وغیرہ)

(۳) تنقید، (موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم)

(۴) شعر و شاعری (مجموعہ کلام اُردو، دیوان شبلی فارسی وغیرہ)

(۵) متفرق مضامین

آپ کی جملہ تصنیفات میں عالمانہ استدلال و انداز پایا جاتا ہے۔ آپ کی تاریخی اور تنقیدی کتابوں کی بڑی خصوصیت تحقیق و تدقیق، استحکام رائے اور جانچ پڑتال ہے۔ طرز ادا میں جدت کے ساتھ دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ فن تنقید کو آپ نے اُردو میں رائج کیا۔ آپ کی زبان مستند ہے۔ طرز تحریر میں صفائی اور سادگی کے علاوہ ایک قسم کا زور ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی چاشنی بھی کہیں کہیں لطف پیدا کر دیتی ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین کو سیدھی سادی عبارت میں سلجھا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان علمی اور تحقیقی ہے۔ لیکن یہی اسلوب بیان ناول اور افسانہ وغیرہ میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ فی زمانہ علم السانی میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے آپ کی تاریخی تحقیقات میں کسی کسی مقام پر خامیاں دریافت ہوئی ہیں۔ لیکن ان چند خامیوں سے مولانا شبلی کی عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

# تبصرہ

اُردو نثر کا چوتھا دَور حقیقت یہ ہے کہ زرّیں دَور ہے۔ اگر تاریخ ادبِ اُردو سے اس دَور کو خارج کر دیا جائے تو غریب اُردو قطعی تہی دست وفرومایہ رہ جائے۔ اس دَور کے مصنّفین کا جواب تاریخ ادب پیش کرنے سے قاصر ہے اور اُمید نہیں کہ آیندہ اس پایہ کے انشا پرداز پیدا ہوسکیں گے۔ ممالک غیر کے ذی علم اصحاب کی اگر نظر پڑتی ہے تو اسی دَور کے مصنّفین پر پڑتی ہے اور اگر وہ اُردو کی کسی تصنیف سے استفادہ کرتے ہیں تو وہ اسی دَور کی تصنیف ہوتی ہے۔

**زبان** | اِس دَور کی زبان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ نہایت مستند اور مکمّل زبان ہے۔

**اسلوبِ بیان** | اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ دَور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دَور کے خاص خاص اسلوب چار ہیں :—

(۱) صاف، سادہ، بے تکلّف اور مدلّل (سرسیّد وغیرہ)۔

(۲) صاف مگر تشبیہ واستعارہ کی گل کاری سے رنگین وحسین (آزادؔ)

(۳) صاف، بے تکلّف، زوردار اور علمی۔ (حالیؔ، شبلیؔ وغیرہ)

(۴) عام بول چال، محاوروں کی کثرت، سادہ، بے تکلّف مگر عربی الفاظ کی کثرت (نذیر احمد)۔

**موضوع** | گذشتہ تمام ادوار کے خاص خاص موضوع مذہب اور افسانہ ہیں۔ لیکن اِس دَور میں اُردو عالمِ شباب کو پہنچی اور اس کے موضوعوں

میں ایسا تنوع پیدا ہوا کہ اس کا شمار علمی زبانوں میں ہونے لگا۔ موضوع یوں تو بے شمار ہیں لیکن خاص خاص یہ ہیں :—

مذہب ، اصلاح مذہب ، تعلیم ، تاریخ ، سوانح حیات ، تحقیق زبان ، اصول تنقید ، ادبی تنقید ، (ناول) وغیرہ - اور ان میں سے ہر موضوع پر نہایت گرانقدر کتابیں لکھی گئیں۔

# باب ۱۴

## مابعد دورِ چہارم

### حصہ اوّل — ناول نگارانِ اردو

#### تمہید

**ناول** "ناول" انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی تو ہیں عجیب اور انوکھی چیز کے لیکن اصطلاح میں افسانوں کی ایک خاص صنف کو کہتے ہیں۔ دورِ سوم کے اختتام تک اُردو میں ناول کا پتہ نہیں۔ یہ دراصل انگریزی چیز ہے اور انگریزوں ہی کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ چوتھے دور میں جہاں انگریزی علوم و فنون کا اثر قبول کیا گیا وہاں "ناول" کو بھی لیا گیا۔ اگرچہ مکمل ناول دورِ چہارم کے بعد ہی لکھے گئے۔

**افسانہ** افسانہ اُردو میں نہایت قدیم چیز ہے۔ ابتدائی افسانے یا تو فارسی

سے ترجمہ کئے گئے۔ یا فارسی افسانوں کی تقلید میں لکھے گئے۔ بڑے بڑے افسانوں میں ذیل کے افسانے خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں :-

۱۔ الف لیلہ ۔ ۲۔ داستان امیر حمزہ ۔ ۳۔ بوستان خیال

۴۔ طلسم ہوش رُبا ۔ ۵۔ قصہ حاتم طائی ۔ ۶۔ باغ و بہار

یہ سب افسانے فارسی سے ترجمہ کئے گئے۔ اِن کے علاوہ بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، گل بکاؤلی، طوطا کہانی، کلیلہ و دمنہ خاص ہندوستانی پیداوار ہیں۔ اگرچہ اِن میں اکثر فارسی ہی سے ترجمہ کئے گئے ہیں فسانہ عجائب خاص اُردو کی پیداوار ہے۔

**ناول اور افسانہ کا فرق**

افسانہ کی بنیاد تمام تر فوق الفطرت عناصر پر ہوتی ہے۔ اُن میں جذبات انسانی اور واقعاتِ زندگی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ کوئی خاص پلاٹ نہیں ہوتا اور نہ کردار نویسی ہوتی ہے۔ واقعات و حادثات خود بخود بلا اسباب کے رونما ہوجاتے ہیں اور اگر وہ ہیرو کے خلاف پڑیں تو فوق العادت اسباب ہی سے اُن کا تدارک بھی ہوجاتا ہے۔ افسانہ کا انجام ہمیشہ ہیرو کی کامیابی پر ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کو اس کامیابی کا اس قدر یقین ہوتا ہے کہ اگر کسی مقام پر ہیرو مر بھی جائے تو پڑھنے والے کے اطمینان میں فرق نہیں آنے پاتا۔ جانتا ہے کہ کہیں نہ کہیں جیتا جاگتا نظر آجائے گا

اِس کے خلاف ناول کی بنیاد "عادت اور فطرت" پر ہوتی ہے —
"ذات انسانی" اُس کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ ناول نگار انسان کا مطالعہ گہری نظروں سے کرتا ہے۔ ناول کا تعلق انسان کے افعال، خیالات، اغلاط

اور خامکاریوں سے ہے۔ روزانہ زندگی کے واقعات، انسان کی فطرت، اس کی تلون مزاجی خوف، احساسات، جوش، جذبات غرض یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔

## اُردو کا پہلا ناول نگار

**شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی**

مولوی نذیر احمد ضلع بجنور میں ۶؍دسمبر ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ مولوی صاحب کے والد مولوی سعادت علی صاحب بجنور میں رہتے تھے۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد بھی چار سال کی عمر میں وہیں پہنچے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر مولوی نصر اللہ خاں سے تعلیم پائی۔ اُس کے بعد فارغ التحصیل ہونے کے لئے دہلی آئے اور مولوی عبد الخالق اورنگ آبادی کے شاگرد ہو گئے۔ لیکن مکتبی تعلیم سے مولوی نذیر احمد دل برداشتہ تھے۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء میں آپ دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اور کالج میں اُن کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ مولوی صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ چار برس بعد یعنی ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات میں چالیس روپیہ ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر ہو کر کانپور پہنچے۔ لیکن انسپکٹر مدارس سے کچھ بگاڑ ہو جانے پر استعفا دے کر دہلی چلے آئے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر الہ آباد پہنچے۔ وہاں آپ نے انگریزی زبان سیکھی اور رفتہ رفتہ نہایت اچھی استعداد پیدا کر لی۔ اُسی زمانے میں گورنمنٹ تعزیرات ہند کا ترجمہ کرانا چاہتی تھی۔ چنانچہ یہ کام مولانا

کے سپرد ہوا۔ آپ نے اس کام کو اس خوبی سے کیا کہ لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے خوش ہو کر آپ کو کانپور کا تحصیلدار کر دیا۔ اور بعد میں ضابطہ فوجداری کا ترجمہ ختم کرنے پر یعنی ۱۸۶۴ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

مولانا کی قابلیت کا شہرہ شدہ شدہ حیدر آباد پہنچا اور آپ کو وہاں طلب کیا گیا۔ آپ ۱۸۷۷ء میں ساڑھے آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر حیدر آباد گئے اور اپنے حسن عمل کے صلہ میں برابر ترقی پاتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں آپ کو سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔ اور بورڈ آف ریوینو کے ممبر ہو گئے۔ لیکن سر سالار جنگ اوّل کی وفات کے بعد آپ پنشن لے کر دہلی چلے آئے۔ یہاں آتے ہی آپ تصنیف و تالیف میں نہایت سرگرمی سے منہمک ہو گئے۔

علمی خدمات کے صلے میں آپ نے گورنمنٹ سے متعدد انعام حاصل کئے۔ نقدی انعامات کے علاوہ ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔

آخر عمر میں صحت نے جواب دے دیا تھا۔ بینائی جاتی رہی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا۔ لیکن لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہتا تھا۔ آخر ۱۹۱۲ء میں اس زبردست انشا پرداز اور محسن زبانِ اردو نے وفات پائی۔

آپ کی جملہ مشہور تصانیف کی فہرست یہ ہے:۔

قانون:۔ تعزیراتِ ہند، قانون شہادت۔

اخلاق و مذہب:۔ ترجمہ قرآن شریف۔ ادعیۃ القرآن، دہ سورہ



داکتر نذیر احمد

مطالب القرآن، الحقوق والفرائض، امہات الائمہ، موعظہ حسنہ۔

ناول :۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، محسنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ۔

مولانا نذیر احمد اپنی تصانیف کی نوعیت اور اپنی انشاپردازی کے لحاظ سے دور چہارم کے مستحق ہیں۔ چنانچہ اسی خیال سے اُن کے نام نامی کو رونق دہِ بزم چہارم کیا گیا ہے اور حالات یہاں درج ہوئے ہیں اس لئے کہ آپ اس بزم کی کرسیِ صدارت پر رونق افروز نظر آتے ہیں۔

مولانا کی زبان خاص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ نہایت صاف، سادہ، رواں اور شیریں۔ تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی دلکشی پیدا کرتے ہیں اور برجستہ محاورات کا تو اس قدر شوق ہے کہ کوئی بات اُن کی لطفِ محاورہ سے خالی نہیں ہوتی۔ متانت اور سنجیدگی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کہیں کہیں سنجیدہ ظرافت سے بھی شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں۔

آپ کی عبارت میں کہیں کہیں نقائص بھی نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات عوام کی زبان لکھ جاتے ہیں۔ محاورات بھی سُبک اور عامیانہ استعمال کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی عربی کے مغلق اور غیر مانوس لغت لے آتے ہیں۔ ترجمۃ القرآن اور دیگر مذہبی کتابوں میں آپ کا لب و لہجہ اور اندازِ بیان کچھ زیب نہیں دیتا۔ بعض مقامات پر آپ نے حفظِ مراتب کا خیال نہیں رکھا اور اللہ تعالیٰ اور رسول کا ذکر کرتے ہوئے ایسی زبان اور ایسے محاورے استعمال کر دیے

جو مناسب نہ تھے۔

مولوی نذیر احمد پہلے انشا پرداز ہیں جنھوں نے اُردو کو ناول سے روشناس کیا۔ آپ کے ناولوں کے نام اوپر درج کیے جا چکے ہیں۔ اگرچہ آپ کے ناول حقیقی معنوں میں ناول نہیں تاہم اُنھیں بجز ناول اور کسی نام سے موسوم کیا بھی نہیں جا سکتا۔ آپ کے ناولوں میں اخلاقی پہلو بہت اُبھرا ہوا ہے۔ آپ کے پیشِ نظر زیادہ تر اصلاح معاشرت اور تعلیم نسواں ہے۔ اور اُن ہی بنیادوں پر آپ ناولوں کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔

آپ کے ناولوں میں ناول کے جملہ عناصر مکمّل یا نامکمّل حالت میں پائے جاتے ہیں۔ اشخاص قصّہ، پلاٹ، مکالمہ، مقصد، اسلوبِ بیان، زبان و مکان۔ اِن کے علاوہ کردار نویسی، سوشل و معاشرتی تصویریں، روزمرّہ واقعات کے نقشے ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ توبۃ النصوح کی ایک شخصیت مرزا ظاہر دار بیگ تو زندۂ جاوید ہے۔

صاحبِ "دنیائے افسانہ" مولانا نذیر احمد صاحب کے ناولوں کو ناول نہیں کہتے۔ حالانکہ اُنھوں نے ناول کے جو جو عناصر اور جو جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ سب اِن ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اُنھیں ناول کیوں نہ کہا جائے۔ ناول تو وہ ضرور ہیں لیکن نامکمّل نمونے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ ابتدائی کارنامے ہیں۔

---

**پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی**

پنڈت صاحب لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت غالباً ۱۸۴۶ء ہے۔ آپ کی عمر چار سال کی تھی کہ آپ کے والد پنڈت بیج ناتھ صاحب درکا سایۂ شفقت سر سے اُٹھ گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس مکان میں حضرت سرشار اپنے لڑکپن کے ایام کھیل کود میں بسر کر رہے تھے اُس کے پڑوس میں اہل اسلام کے مکانات تھے۔ آپ اُن کے زنان خانوں میں بچّوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ شریف خاتونوں سے آپ نے بیگمات کی زبان اور طرز معاشرت سے بہت کچھ آگاہی حاصل کی جو آئندہ چل کر آپ کی شہرت کا باعث بنی۔ آپ نے ابتداً عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اِسی کے بعد کیننگ کالج میں داخل ہوئے لیکن کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ حصولِ معاش کے لئے کھیری کے ضلع اسکول میں مدرّس ہو گئے۔

اُس زمانے میں "مراسلہ کشمیر" نامی ایک رسالہ نکلتا تھا جس میں اصلاحی مضامین نکلا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں "اودھ پنچ" بھی اپنا رنگ جما رہا تھا۔ حضرت سرشار کی انشاپردازی کی ابتدا اِن ہی رسائل سے ہوئی۔ آپ برابر مضامین لکھ کر اِن رسائل میں شائع کرایا کرتے تھے۔ آپ کے ابتدائی مضامین میں مرزا رجب علی بیگ سرور کا رنگ صاف نمایاں ہوتا تھا لیکن شوخی اور دلکشی کچھ اُن سے زیادہ تھی۔ اُسی زمانے میں سررشتۂ تعلیم کی جانب سے ایک اخبار نکلتا تھا۔ اُس میں اکثر علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ آپ بھی اُس اخبار میں مضامین بھیجتے تھے۔

۱۸۷۸ء میں ایک علم طبعی کی کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور شمس الضحیٰ اُس کا نام رکھا۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور اس نے آپ کی شہرت کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔

منشی نولکشور اودھ اخبار نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ اُس کی ایڈیٹری حضرت سرشار کو تفویض ہوئی۔ آپ کا مایۂ ناز کارنامہ "فسانۂ آزاد" اسی اخبار میں بالاقساط نکلا کرتا تھا۔ اسی اشاعت نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اور ملک کے گوشے گوشے میں آپ کا طوطی بولنے لگا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں آپ کو حیدرآباد طلب کیا گیا جہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے آپ کی خاطر خواہ قدرافزائی فرمائی۔ لیکن افسوس کہ آپ نے خود اپنی قدر نہ پہچانی۔ آپ کی بے اعتدالیوں سے آپ کے قویٰ میں ضعف آتا گیا۔ "فسانۂ آزاد" میں دختِ رز کی مذمت نئے نئے انداز سے کی ہے لیکن یہی دختِ رز اپنے ہجو اور مذمت کرنے والے کے لئے تپ دروں بن گئی اور اس کو گھلا گھلا کر کانٹا کر دیا۔ آخر ۱۹۰۲ء میں حضرت سرشار نے رحلت فرمائی۔

یوں تو حضرت سرشار نے متعدد تصنیفات یادگار چھوڑیں لیکن مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:۔

"فسانۂ آزاد"۔ "سیر کوہسار"۔ "جامِ سرشار"۔ "خدائی فوجدار"۔ "طوفان بے تمیزی"۔ "کامنی" وغیرہ۔ ان میں سے "فسانۂ آزاد" کو جو شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے وہ اب تک کسی اور فسانہ اور ناول کو حاصل نہ ہو سکی حقیقت یہ ہے کہ یہ فسانہ اپنے مصنّف کو زندۂ جاوید رکھنے کے

لئے کافی ہے۔

"فسانۂ آزاد" بڑی تقطیع کی چار ضخیم جلدوں کا مالک ہے۔ اور اُردو میں ابتدائی اور نامکمل ناول کا عمدہ نمونہ ہے۔ لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کی سچی تصویریں جیسی اس فسانہ میں ملتی ہیں اُن کا عشرِ عشیر بھی کہیں اور نظر سے نہیں گزرتا۔ اِن تصویروں نے اس فسانے کو ناول کے مرتبہ پر پہنچایا اور کتاب کی دلچسپی میں چار چاند لگائے۔ لیکن "فسانۂ آزاد" کی کامیابی کا اصلی راز حضرت سرشار کی جادو طرازی ہے۔ حضرت سرشار کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ محاورہ اور روزمرّہ کی شوخی آپ کا خاص رنگ ہے۔ بیان میں شگفتگی اور طرزِ ادا میں رنگینی ہے۔ آپ نے مکالمہ میں کمال دکھایا ہے۔ اگرچہ آپ کا ذاتی طرزِ ادا مقفیٰ اور رنگین ہے لیکن مکالموں میں آپ نے مختلف رنگ اختیار کئے ہیں۔ مگر برجستگی کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ سوشل زندگی کی مصوّری، منظرنگاری اور مکالمہ میں آپ خاص طور پر کامیاب ہیں اور اس کامیابی کا راز آپ کی شوخی اور زندہ دلی میں مضمر ہے یہی وجہ ہے کہ جب سنجیدگی پر اُترتے ہیں اور ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں تو آپ کی عبارت میں سُستی اور پھسپھسا پن پیدا ہو جاتا ہے۔

اگرچہ آپ کے ناول پلاٹ سے اور آپ کے اشخاصِ قصّہ یکرنگی سے بے نیاز ہوتے ہیں لیکن اُن کی دلچسپی اور دلکشی کا یہ عالم ہے کہ یہ خامیاں محسوس نہیں ہونے پاتیں۔

---

## منشی سجاد حسین

منشی سجاد حسین، اودھ پنچ کے شہرۂ آفاق ایڈیٹر خلف الرشید منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر قصبہ کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں نشوونما اور ابتدائی تعلیم پائی۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ فیض آباد چلے گئے۔ اور وہاں محکمۂ فوج میں اُردو ٹیچر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ لیکن اُفتادِ طبع نے مدرّسی کو پسند نہ کیا۔ ایک سال ملازمت کرنے کے بعد مستعفی ہو کر آپ لکھنؤ واپس چلے آئے۔

لکھنؤ پہنچ کر علمی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" جاری کیا جو اُن کی اصلی شہرت کا باعث بنا۔ اودھ پنچ کانگریس کا حامی تھا اور آخر وقت تک اُسی کی حمایت میں زعفران زار بنا رہا۔

منشی صاحب فالج کی وجہ سے ۱۹۰۴ء کے بعد مجبور اور معذور ہو گئے تھے۔ قوت گویائی بھی قریب قریب سلب ہو چکی تھی مگر اودھ پنچ برابر نکالتے رہے۔ آخر مالی دشواریوں اور کچھ جسمانی معذوریوں سے دق آکر ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ کو بند کرنا پڑا۔ خود بھی زیادہ زندہ نہ رہ سکے اور دو سال بعد ابتدائے ۱۹۱۵ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

منشی صاحب کا مزاج عجیب صفات کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ زباندانی اور انشاپردازی آپ کی مسلّم ہے۔ آپ کے بیان میں ندرت، تحریر میں شگفتگی، نتائج میں دلنشینی اور انداز میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خیالات میں بے باکی اور آزادی اِس بلا کی تھی کہ جو کچھ چاہتے تھے کہہ گزرتے تھے۔ گورنمنٹ تک پر فقرے چست

کرتے تھے اور کسی کی توہین نہیں کیا ہے۔ ظرافت چونکہ آپ کی تحریر کا جوہر ہے لہٰذا تشبیہ و استعارہ بھی ظرافت آمیز استعمال کرتے ہیں۔

"اودھ پنچ" کے علاوہ چند مزاحیہ ناول بھی آپ کے مشہور و معروف کارنامے ہیں۔ جن میں "حاجی بغلول"۔ "ظریف دار لونڈی"۔ "احمق الذین"۔ "کایا پلٹ" زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

آپ کے ناولوں کو پلاٹ اور کردار نگاری کے لحاظ سے گزشتہ تمام ناولوں پر فوقیت حاصل ہے اور ارتقائے ناول میں آپ کے کارنامے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ "حاجی بغلول" زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔

## مولانا عبدالحلیم شرر

مولانا شرر لکھنؤ میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ لیکن مکتبی تعلیم میں کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ آپ کے والد حکیم تفضل حسین صاحب واجد علی شاہ کی ملازمت میں مٹیا برج کلکتہ میں مقیم تھے۔ انھوں نے مولانا شرر کو ۱۸۶۹ء میں اپنے پاس بلا لیا۔ وہاں آپ نے فارسی، عربی اور فارسے انگریزی پڑھی۔ مٹیا برج کے قیام کی بدولت شہزادوں سے خصوصیت تھی اور تعلقات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ شہزادوں کو بغیر آپ کے اور آپ کو بغیر شہزادوں کے چین نہ پڑتا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ شہزادوں کے ساتھ آپ کی رسائی زنانخانہ تک تھی۔ اور مولانا کی زباندانی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

مولانا ۱۸۷۷ء میں کلکتہ چھوڑ کر لکھنؤ تشریف لائے۔ یہاں بھی تحصیلِ علم

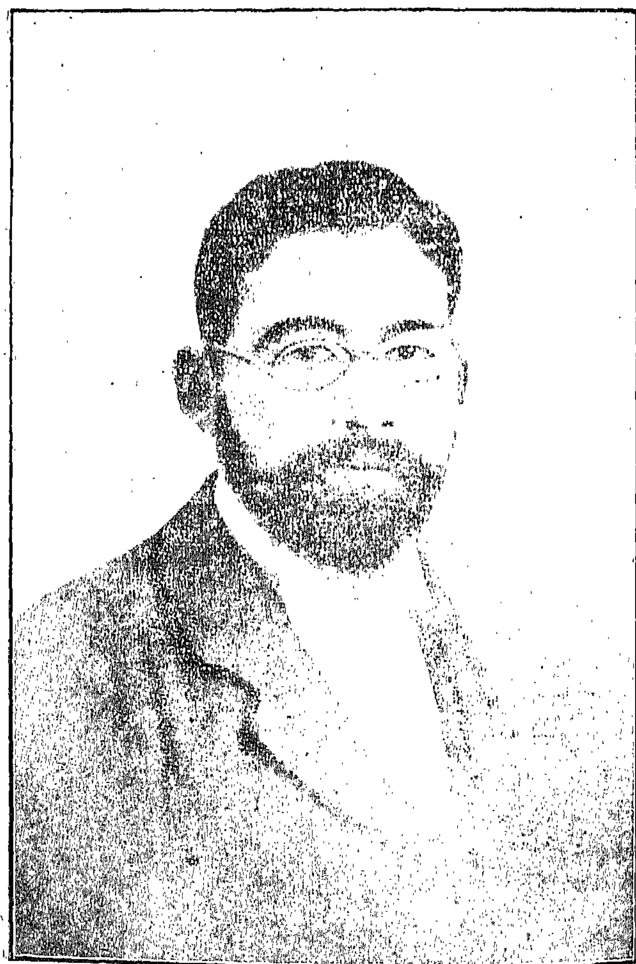
برابر جاری رہا۔ شوقِ علم آپ کو ۱۸۷۹ء میں دہلی لایا جہاں آپ نے مولوی نذیر حسین سے حدیث پڑھی اور ڈیڑھ سال کے بعد واپس لکھنؤ پہنچے۔ قیامِ دہلی کے دَوران میں آپ نے محمد بن الوہاب نجدی کے رسالۃ التوحید کا ترجمہ کرکے شائع کیا۔ یہ آپ کی پہلی ادبی کوشش تھی۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر آپ اودھ اخبار کے اسسٹنٹ بمشاہرہ ۳۰ روپیہ مقرّر ہوئے۔ یہاں سے آپ کی ادبی شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ مسلسل دو سال تک علمی، خیالی اور فلسفیانہ مضامین لکھتے اور اخبار میں شائع کرتے رہے۔ اور ملک میں ہر طرف آپ کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔

کچھ عرصے بعد آپ نے اودھ اخبار سے قطع تعلق کرکے خود اپنا ایک ماہوار رسالہ "دلگداز" نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ جنوری ۱۸۸۶ء سے جاری ہوا اور ختم سال تک اس کے دو ہزار خریدار ہوگئے۔ اس رسالہ میں زیادہ تر شاعرانہ و عاشقانہ خیالی مضامین ہوتے تھے یا کبھی کبھی کوئی تاریخی مضمون بھی چھپ جاتا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں ایک جزو ناول کا بھی اس میں اضافہ کیا اور "ملک العزیز ورجنا" اس میں بالاقساط شائع ہوا۔ اور پھر متعدد ناول اسی طرح شائع ہوئے۔ لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے آپ کو ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد کا سفر کرنا پڑا۔

حیدر آباد میں نواب وقار الامرا نے آپ کی قدر دانی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ آپ کو ۱۸۹۳ء میں انگلستان بھیج دیا۔ تین سال آپ وہاں رہے اور اس مدت میں آپ نے فرانسیسی زبان سیکھی۔

انگلستان سے واپس آکر آپ حیدر آباد پہنچے۔ اور "دلگداز" کا دفتر بھی



مولانا عبدالحلیم شرر

وہیں اٹھالے گئے۔ ۱۹۰۹ء تک آپ کئی بار لکھنؤ آئے گئے۔ لیکن ۱۹۰۹ء میں حضور نظام کے حکم سے آپ کو حیدر آباد ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ آپ نے اپنے وطن میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور ادبی خدمات میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ آخر ۱۹۲۶ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ دلگداز آخر وقت تک شائع ہوتا رہا۔

مولانا شرر کی جملہ تصنیفات کو ہم چار موضوع پر تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) ناول (۲) تاریخ، (۳) لکچر (۴) متفرق مضامین۔ چونکہ اس باب میں ہمیں ناول ہی سے سروکار ہے۔ لہذا باقی موضوعوں کو نظر انداز کرتے ہیں:-

مولانا کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ نہایت شستہ، صاف، سلیس اور رواں ہے۔ طرز بیان شگفتہ اور بے تکلف ہے۔ تشبیہ و استعارہ کا بہت شوق ہے لیکن یہ زیادہ تر ناولوں میں ہے۔ تاریخی کتابوں میں آپ کا انداز نپا تلا ہے۔ عبارت آرائی نہیں پائی جاتی۔ منظر نگاری میں آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ لیکن اکثر اوقات جذبات کی شدت اس میں شامل ہو کر تصاویر کو دھندلا کر دیتی ہے۔

مولانا کے ناول دو حصوں پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک معاشرتی، دوسرے تاریخی۔ دوسری قسم کے ناول یعنی تاریخی اُن کی حقیقی شہرت کے باعث ہیں۔ اُن تاریخی ناولوں کا مقصد قدیم اسلامی حالات کو منظر عام پر لانا اور اُن کی اہمیت کا احساس دلانا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ہر انقلاب کن واقعہ پر ایک ایک ناول لکھا گیا ہے۔ اور اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کے نہایت عمدہ نقشے دکھائے گئے ہیں۔

آپ نے ناول کو ہر دلعزیز بنانے اور اُسے معیار بلندی تک پہنچانے کی بے دریغ کوشش کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ناول کو انگریزی ناول کے ہم پلہ کر دکھایا ہے۔ آپ کے بعض ناول مثلاً فردوس بریں، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا وغیرہ بڑے پایہ کے ناول اور ہر لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔

آپ کی ناول نگاری میں بعض خامیاں بھی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ تاریخی واقعات میں صداقت کا سر رشتہ کہیں کہیں ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ دوسرے اشخاصِ قصہ میں جذبات، خیالات، احساسات وغیرہ کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ یکسانیت اس قدر اُجاگر ہو جاتی ہے کہ بجز ناموں کے اشخاص میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ لیکن اِن خامیوں کے باوجود مولانا شرر کا مرتبہ بحیثیت ناول نگار بہت بلند ہے۔ اور اگر تاریخی چھان بین اور موشگافیوں سے قطع نظر کر لی جائے تو آپ اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے انگریزی اصول پر ناول لکھے۔

**مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی**

مرزا محمد ہادی نام رسوا تخلص، خلف آغا محمد تقی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۸۵۸ء ہے۔ سولہ برس کی عمر میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر انگریزی پڑھنی شروع کی اور انٹرنس پاس کیا۔ رڑکی جا کر اوورسیری کا امتحان دیا اور کوئٹہ اور بلوچستان کی ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ لیکن اُفتادِ طبع اس لئے کیفیت ملازمت کے خلاف تھی۔ چنانچہ ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور علم کیمیا (کیمسٹری)

کی تحصیل میں منہمک ہو گئے۔ لکھنؤ مشن اسکول میں فارسی کے مدرس بھی ہو گئے تھے۔ لیکن کیمسٹری کا شغل برابر جاری تھا۔

پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان آپ نے پاس کر لیا تھا۔ اس لئے اپنی یونیورسٹی سے بی۔ اے بھی پرائیویٹ طور پر پاس کیا اور امریکہ کی "اورینٹل یونیورسٹی" سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ متعدد زبانیں جانتے تھے۔ چنانچہ، عربی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔ ان زبانوں کے علاوہ منطق، فلسفہ اور ریاضی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ شاعر بھی اچھے تھے اور مرزا اوج کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ ناول نگاری میں خاص نام پیدا کیا تھا۔ منجملہ دیگر ناولوں کے "امراؤ جان ادا" شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید ناول ہے۔

بڑھاپے میں آپ کا تقرر دارالترجمہ عثمانیہ میں ہو گیا تھا۔ لیکن گاہے گاہے لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ خاکسار نے ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں مسلم ہوسٹل الہ آباد کے سالانہ مشاعرے میں آپ کی زیارت کی تھی اور غزل بھی سنی تھی۔ جیسے خود منحنی تھے ویسی ہی آواز بھی منحنی تھی۔ پڑھنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا باتیں کر رہے ہیں۔ ایک شعر کوشش کے بعد سن کر یاد کیا تھا۔ تبرک کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

(اس غزل کے چند اشعار "امراؤ جان ادا" میں درج ہیں۔)

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا     لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

آخر یہ مجموعۂ کمالات ۱۷؍اکتوبر ۱۹۳۱ء کو دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ مرزا صاحب کا منظوم کلام نہ کہیں شائع ہوا اور نہ غالباً کہیں محفوظ ہے۔ آپ کی چند غزلیں "امراؤ جان آدا" میں نظر سے گذریں، دو چار شعر مسلم ہوسٹل الہ آباد کے مشاعرے میں سُنے۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کی سلاست اور نُدرت اور طرز ادا کی برجستگی اور جذبات وخیالات کی سادگی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

آجکل مرزا صاحب کی شہرت زیادہ تر اُن کی نثر نگاری کی وجہ سے ہے۔ آپ کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی اور نُتھری زبان ہے۔ لکھنؤ کے روزمرّہ اور محاورات پر پوری قدرت حاصل ہے۔ طرز بیان میں سادگی، صفائی اور نرمی کے جوہر موجود ہیں۔ عبارت کا انداز ایسا ہے گویا بات چیت کر رہے ہیں۔ شگفتگی بھی آپ کی عبارت میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

مرزا صاحب اپنے ناولوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی۔ نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ اُن میں سے کسی نے خودکشی کی ہے۔ نہ ہجر ہوا ہے نہ وصل۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیئے" اور یہ حقیقت ہے کہ آپ کے ناولوں کا زماں عصر حاضرہ ہے اور مکاں لکھنؤ۔ اشخاص قصّہ لکھنؤ یا قرب وجوار کے باشندے ہیں۔ اور اُن کے پلاٹ روزانہ زندگی کے واقعات سے لئے گئے ہیں۔ فطرت وحیات انسانی کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ہر سوسائٹی کے آدمی کو لیا ہے۔ اور اُس کے عیب وہُنر کو طشت ازبام کر دیا

ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب کے ناولوں میں دلچسپی کا بے انتہا سامان موجود ہے۔

---

## مولانا راشد الخیری

مولانا راشد الخیری شمس العلما مولوی نذیر احمد کی بیوی کے سگے بھتیجے اور دلی کے ایک معزز و عالی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نظام گورنمنٹ میں محکمہ بندوبست کے افسر اعلیٰ تھے۔

عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر کے افراد سے حاصل کرنے کے بعد عربک اسکول میں داخل ہوئے اور یہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد محکمۂ بندوبست میں کچھ عرصے تک خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے مستورات کے لئے ماہنامہ "عصمت" جاری کیا جو اب تک خواتین ہند خصوصاً مخدراتِ اسلام کی فلاح و بہبود میں مصروف ہے۔ اور مولانا مرحوم کی زبردست کوششوں کی زندۂ جاوید یادگار ہے۔

مولانا نے ابتداً تحریر میں مولوی نذیر احمد کی پیروی اختیار کی تھی۔ لیکن کچھ مدت بعد اُن کا اپنا رنگ اُبھر آیا۔ شروع سے آپ کو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی تھی۔ جو عمر بھر باقی رہی۔ ان کی تمام تصنیفات میں یہ دلچسپی موجود ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس دلچسپی نے آپ کو مصنف بنایا تو بیجا نہ ہوگا۔ عورتوں کی جہالت اور پستی کو دور کرنے اور مردوں کو اُن پر رحم دلانے میں مولانا نے پورا حصّہ لیا۔ آپ شاعر بھی تھے۔ لیکن

آپ کی تمام ناولیں عورتوں ہی کے حقوق کی حمایت اور عورتوں کی اصلاح کے متعلق ہیں۔ اگرچہ اب سے ستر برس پہلے آپ پیدا ہوئے تھے یعنی ہنگامۂ غدر کے بعد۔ مگر آپ کے دل و دماغ میں دو سو برس پہلے کے سمے بھرے تھے۔ وہ موجودہ مسلمان لڑکیوں کو دو سو برس پہلے کی لڑکی کی صورت میں دیکھنے کے آرزومند تھے۔

مولانا کی مشہور تصانیف میں "صبح زندگی" اور "شام زندگی" کو جو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے جن میں زیادہ تر ناول ہیں۔ جن کا تعلق مستورات کی اصلاح سے ہے۔

افسوس کہ یہ زبردست انشاپرداز، ناول نگار اور عورتوں کا ہمدرد اور مونس و غمگسار ۱۳ فروری ۱۹۳۶ء کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔

مولانا کی زبان خاص دہلی کی اُردوئے معلی ہے۔ آپ کا روزمرہ عہدِ حاضرہ کے انگریزی اثر سے قطعی پاک اور ٹھیٹ ٹکسالی ہے۔ عورتوں کی زبان اور بیگمات کے محاورں پر عبور حاصل ہے اور اُن کو نہایت لطف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ ملائم اور شیریں ہیں، زبان سادہ اور شگفتہ۔ طرزِ بیان ایسا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے تاثیر کا طلسم باندھتے ہیں۔ آپ حزن و ملال کے بادشاہ ہیں۔ ہر تصنیف میں بیکسی کے مرقعے اور یاس کی تصویریں پڑھنے والوں کو بے چین کر دیتی ہیں۔ غم والم کے

مناظر کو الفاظ میں جس طرح آپ بیان کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملک میں آپ کا لقب "مصورِ غم" مشہور ہے۔

آپ کے ناول ایک مخصوص و محدود طبقے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے اشخاص اور واقعات اور طرزِ ادا میں طبیعت کو اُکتا دینے والی یکسانیت و یکرنگی ہے۔ چونکہ مولانا ہر شئے کو صنفِ لطیف کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اندازِ بیان بھی یکگانی ہی ہوتا ہے اس لئے آپ کے ناولوں میں مصنوعیت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ حُزن و ملال کے غلبے کی وجہ سے بھی طبیعت پراگندہ اور مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے۔

---

**ظفر عمر** آپ کے حالات باوجود سعیٔ بلیغ دستیاب نہیں ہوئے۔ چونکہ آپ اُردو میں ناول نگاری کے ایک خاص صنف کے موجد ہیں۔ اور ایک مدت تک پنجاب میں آپ کی ایجاد کی تقلید ہوتی رہی لہٰذا آپ کے نام نامی کو زیبِ داستان بناتا ہوں۔ آپ کے متعلق صرف اس قدر دریافت ہوا کہ آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور محکمۂ پولیس میں کسی ممتاز عہدے پر مامور ہیں۔

آپ نے اُردو ناول نگاری میں سُراغ رسانی کے قصّوں کا اضافہ کیا۔ اور اس رنگ کے آپ موجد ہوئے۔ آپ کی دو کتابیں "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" خاص شہرت رکھتی ہیں۔ دونوں کتابیں ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ ہنوز یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مصنف کو ایک حادثہ

پیش آیا جس کی وجہ سے آپ کی ٹانگ میں ضرب شدید آئی اور سلسلہ نامکمل رہ گیا۔

مدت ہوئی خاکسار نے ایک انگریزی ناول پڑھا تھا۔ اُس کا نام اعداد میں ہے۔ یہ تو اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ عدد کیا تھا لیکن یہ خیال ہے کہ یا تو ۸۰۵ تھا یا ۸۱۳ یا پھر ۸۰۵۔ اُن ایام میں خاکسار نے بہت کوشش کی لیکن وہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" حقیقت میں اس انگریزی ناول کا ترجمہ ہے لیکن اس سلیقے سے کیا گیا ہے کہ کہیں سے ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ کتابوں کو ہر لحاظ سے ہندوستانی رنگ میں اس طرح رنگ دیا ہے کہ قطعی ہندوستان کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ زبان اور طرز بیان بھی نہایت صاف۔ رواں اور شگفتہ ہے۔

## تبصرہ و کیفیت

اس دور میں بڑے بڑے قابل بزرگ نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی انشاپردازی سے اُردو کو باغ و بہار کیا۔ لیکن توجہ زیادہ تر ناول کی طرف مبذول رکھی۔ ناول کے موجد ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی نے ناول کو ناول کی حیثیت سے نہیں لکھا بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک دلچسپ سلسلہ کتابوں کا مرتّب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ناولوں میں اخلاقی پہلو بہت اُبھرا ہوا ہے۔ اُن کے اشخاص قصّہ عموماً روشن خیال اور مذہب پرست ہوتے ہیں۔ اُن کے ناول حُسن و عشق سے بھی مبرّا ہیں۔ اُن میں شعریت بالکل نہیں اور یہی وجہ

ہے کہ ہم انھیں مکمل ناول نہیں کہہ سکتے۔

بالکل یہی حال علامہ راشد الخیری کے ناولوں کا ہے۔ مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ آپ کے ناولوں میں حزن و ملال کا عنصر غالب ہے۔ ظاہر ہے کہ پڑھنے والا ہر وقت حزن و ملال، یاس و غم وغیرہ کے لئے تیار نہیں رہتا۔ خوشی و مسرت اور ظرافت و زندہ دلی کی بھی اُسے تلاش ہوتی ہے۔ وہ تنوع چاہتا ہے اور یہ باتیں اِن ناولوں میں مفقود ہیں۔

حضرت سرشار کے افسانوں کو ایک محدود معنوں میں ناول کہہ سکتے ہیں۔ اُن میں سب سے بڑی خرابی پلاٹ اور ترتیب کی ہے۔ تسلسل افعال اور اشخاص قصّہ کے کردار میں استقلال بھی آپ کے افسانوں میں مفقود ہیں۔ محض مکالمہ کی خوش اسلوبی اور لکھنؤ کی طرز معاشرت کے صداقت آمیز بیان کے اعتبار سے ہم اِن افسانوں کو ناول کہہ سکتے ہیں۔

لے دے کے شرر، منشی سجّاد حسین، مرزا رسوا اور ظفر عمر صاحب کے ناولوں پر نظر جمتی ہے۔ منشی صاحب کے ناولوں میں ظرافت ہی ظرافت ہے۔ اور ظفر صاحب کے ناول محض سراغ رسانی سے متعلق ہیں۔ شرر نے البتہ مختلف قسم کے ناول لکھے، جن میں تاریخی ناول خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ لیکن اُن میں بھی واقعات کے عدم صداقت اور اشخاص قصّہ کی یکسانیت کے عیوب پائے جاتے ہیں۔ حضرت رسوا کے ناول اچھے ہیں۔ لیکن انگریزی ناولوں سے اُن کے ناولوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بھی کہیں کہیں فنی نقص موجود ہیں۔

اگرچہ اِن مشہور ناول نگاروں کے علاوہ منشی عبدالغفور اور احمد حسین خاں، اور حکیم محمد علی خاں وغیرہم نے بھی بعض اچھے ناول لکھے جو ایک حد تک مقبول بھی ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو اب تک فنی اعتبار سے عمدہ اور مستند ناول پیش کرنے سے قاصر رہی۔ اور شاید قاصر ہی رہے۔ کیونکہ فی زمانہ ناول نگاری سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی ہے۔

# باب ۱۷

## مابعد دورِ چہارم

### حصّہ دوم متفرقات

### ۱۔ مختصر افسانہ نگارانِ اُردو

### تمہید

**مختصر افسانہ** مختصر افسانہ انیسویں صدی کی ایجادات میں سے ہے۔ یہ ناول کی طرح حیاتِ انسانی کا مکمل تجربہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حیاتِ انسانی کے کسی خاص رُخ یا کسی خاص واقعہ کا مؤثر اور دلچسپ بیان ہوتا ہے۔

**قدیم مختصر افسانہ** مختصر افسانہ یوں تو اُردو میں بہت قدیم ہے۔



منشی پریم چند

فورٹ ولیم کالج کے عہد میں مختصر افسانے بہت لکھے گئے لیکن اُن مختصر افسانوں اور موجودہ مختصر افسانوں میں وہی فرق ہے جو افسانہ اور ناول میں (ملاحظہ ہو باب ۱۶) اُردو میں مختصر فنی افسانوں کی پیدائش براہ راست مغربی قصّوں کے اثر کے ماتحت ہوئی۔ اور منشی پریم چند سب سے پہلے قصّہ نگار ہوئے۔

**منشی پریم چند** آپ کے مختصر افسانوں کے دو مجموعے "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے قصّوں کی خصوصیات یہ ہیں :-

عمیق مطالعہ فطرت، واقعات روزمرّہ کا بیان، جذباتِ انسانی کی صحیح مصوّری، دیہاتی زندگی کے مرقعے، کردار اور منظر نگاری آپ کے قصّوں میں حزنیہ اور طربیہ دونوں طرح کے قصّے موجود ہیں۔ لیکن آپ کے حزنیہ قصّے طربیہ قصّوں سے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔

زبان اور طرزِ بیان بھی قابل ستائش ہے۔ شستہ اور سلیس زبان اور اُس پر بے تکلّف اندازِ بیان سے آپ کی عبارت عام طور پر شگفتہ اور پُرلطف ہوتی ہے۔

آخر میں یہ بات بھی عرض کر دینی نامناسب نہ ہوگی کہ اگرچہ منشی صاحب مختصر افسانوں کے بانی ہیں لیکن ابتدا ہی سے آپ نے اِس فن میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ اب تک کوئی اور افسانہ نگار آپ کے مقابلے پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا مرتبہ بہ حیثیت افسانہ نگار بہت بلند ہے۔

**سُدرشن** پنڈت بدری ناتھ سُدرشن نے بھی مختصر افسانہ نگاری میں خاص شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کی ہے۔ آپ کے افسانے جذبات کو اُبھارتے ہیں۔ ہر ایک قصّے میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ جذبات انسانی کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔ قصّہ کا پلاٹ ڈرامیٹک ہوتا ہے۔ خوبیٔ زبان اور لطافتِ بیان کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔
منشی پریم چند کی طرح آپ کے افسانوں میں بھی مقامی رنگ بڑی حد تک جلوہ فرما ہوتا ہے کردار نویسی آپ کا خاص جوہر ہے۔ ہر درجہ اور ہر سوسائٹی کے لوگوں کے کردار کو فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔

---

**نیاز فتح پوری** نیاز فتحپوری مشہور و معروف رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر و مالک۔ نثر میں ایک خاص طرز اور اسلوب کے موجد اور مالک ہیں۔ آپ الفاظ اور تراکیب کے حُسن اور زورِ بیان سے اپنی عبارت میں ایک مخصوص رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ بندشِ الفاظ نہایت چُست ہوتی ہے جس سے خود بخود ایک موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے اور عبارت کی دلکشی بہت بڑھ جاتی ہے۔
یوں تو حضرت نیاز نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور ہر جگہ اپنی ادبی شان کو برقرار رکھا ہے لیکن مختصر افسانہ نویسی میں آپ کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" شائع ہو کر شہرت عام حاصل کر چکے ہیں۔ اِن افسانوں میں

بعض ترجمے ہیں اور باقی آن ہی کی دماغی تخلیق ہیں۔

حضرت نیازؔ کے قصّوں میں تخیّل کی بلندی سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ اِن میں صداقت کی کمی ہے لیکن یہ کمی آپ کے اسلوب بیان کے جادو اور تخیل کی سحر طرازی کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتی۔ اشخاص قصہ جیتے جاگتے انسان نہیں ہوتے بلکہ وہ چند کیفیات اور جذبات کا مجموعہ ہوتے ہیں جن کو مصنّف کا دماغ محض تخیل کے زور سے پیدا کر لیتا ہے۔ آپ کے افسانوں کا موضوع حسن و عشق ہے۔ نہ اُن سے کسی قسم کی اصلاح مدِنظر ہوتی ہے اور نہ وہ کوئی اخلاقی درس دیتے ہیں، وہ محض حسین خیالات ہیں جن کو نیاز صاحب اپنی رنگینیٔ ادا سے حسین تر بنا دیتے ہیں۔

---

**سجّاد حیدر یلدرم** | آپ کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" کے نام سے دنیائے ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس میں کچھ افسانے تو تُرکی افسانوں کے ترجمے ہیں، کچھ انگریزی کے اور کچھ طبع زاد ہیں۔

حضرت نیازؔ کی طرح سجّاد صاحب بھی خیالی پیکر بنانے میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ جذبات نگاری میں بھی آپ کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ وہ افسانے جو غیر زبانوں سے ترجمہ ہوئے ہیں، وہ اپنی بلندیِ تخیل اور زورِ بیان کے لحاظ سے اکثر اصل افسانوں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ترجمہ اس سلیقے سے ہوا ہے کہ کہیں ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔

آپ کی عبارت میں ایک خاص انداز کا بانکپن اور بندشوں میں جدّت اور شگفتگی ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ طرزِ بیان میں برجستگی اور نُدرت عجیب شعریت پیدا کر دیتی ہے۔ فارسی تراکیب سے بہت کام لیتے ہیں لیکن کہیں کہیں یہ تراکیب غیر مانوس بھی ہو جاتی ہیں۔

---

**خواجہ حسن نظامی** خواجہ صاحب موجودہ عہد کے اہلِ قلم حضرات میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں آپ کی زبان اور طرزِ بیان کی دھوم ہے۔ آپ کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ سادگی، برجستگی، روانی، شیرینی اور عام فہمی آپ کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ زبان میں نزاکت اور رنگینی بھی بلا کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور اُن میں صفائی اور چُستی سے آپ کی تحریر میں شگفتگی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلوب بیان میں متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے مگر کہیں خشکی اور روکھاپن نہیں آنے پاتا۔

خواجہ صاحب کی پچاس ساٹھ تصنیفات شائع ہو کر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں۔ ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

آپ کی اکثر تصنیفات مسلمانوں کی اندوہناک حالت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ غدر کے بعد خاندان مغلیہ کی بیگمات پر جو کچھ گزری اُس کا بیان نہایت سوز و گداز اور پُر تاثیر انداز میں کرتے ہیں۔ غمناک مناظر کے بیان میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

آپ کے مختصر افسانے فطرت کی مصوری کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔ سوز و گداز کا عنصر بھی اُن میں ایک مخصوص انداز رکھتا ہے۔ آپ نے تخیلی مضامین اور تخیلی افسانے لکھ کر موجودہ انشا پردازوں میں ایک امتیازی شان پیدا کر لی ہے۔ آپ کے مضامین میں روحانیت ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔ آپ نے لالٹین، دیا سلائی، برف وغیرہ پر مضامین لکھے ہیں لیکن اِن معمولی اور حقیر چیزوں کی آڑ میں آپ صوفیانہ اور اخلاقی نکات حل کرتے ہیں۔ آپ کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں روحانیت نظر آتی ہے اور جو اثر آپ کے دل پر مترتب ہوتا ہے اُس کو عام فہم اور پُر تاثیر انداز میں پیش کر دیتے ہیں اور پھر اُس کا لفظ لفظ عام پڑھنے والوں کے لئے درسِ معرفت بن جاتا ہے۔

## ۲۔ صحیفہ نگارانِ اُردو

**تمہید** "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دہلی سے جاری ہوا۔ یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا کہ آزاد کے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔

۱۸۳۶ء کے بعد متعدد اخبار ملک کے متعدد گوشوں سے جاری ہوئے اور بند ہو گئے لیکن اُن اخباروں میں سے کسی نے بھی کوئی خاص امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی۔ البتہ ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے اودھ پنچ نکالا۔ اور اپنی ذاتی قابلیت اور مخصوص رنگ کی بدولت اُسے زندۂ جاوید کر دیا۔ منشی صاحب صحیفہ نگارانِ اُردو میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں چونکہ آپ کا

ذکر باب ۱۷ (حصّہ اوّل) میں گزر چکا ہے۔ لہٰذا اب اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

اس وقت تک اُردو میں سیکڑوں اخبار اور رسائل نکلے۔ کچھ بند ہو گئے۔ کچھ جاری ہیں۔ آئے دن نئے اخبار اور رسائل نکلتے رہتے ہیں۔ اس وقت موجودہ اخبارات اور رسائل کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ لیکن اِن اخبار اور رسائل میں بہت کم ایسے ہیں جن کے ایڈیٹروں نے ملک میں صحیفہ نگار کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی ہو۔ خاکسار بعض مالکان اخبار و رسائل کی قابلیت و انشا پردازی کا قائل ہے لیکن اِس حقیقت سے ناچیز انکار نہیں کرسکتا کہ اِن میں بجز منشی سجاد حسین مرحوم، حضرت نیاز فتحپوری، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کے کسی اور بزرگ نے صحافت میں کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔

اس باب کا یہ حصّہ صحیفہ نگاران اُردو کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ منشی سجاد حسین مرحوم کا ذکر ہو چکا۔ حضرت نیاز فتحپوری کا ذکر اسی باب کے حصّہ اوّل میں گزر چکا۔ یہاں مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا تذکرہ کرنا ہے۔

**ابو الکلام آزاد**

مولانا ابو الکلام آزاد کا شمار عہد حاضرہ کے بہترین انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ "الہلال" نے آپ کے مخصوص اندازِ بیان کو اور آپ کے مخصوص اندازِ بیان نے "الہلال" کو شہرت عام اور بقائے دوام بخشی۔ اخباروں میں "الہلال" نے جو شہرت

اور مقبولیت حاصل کی تھی آج تک کسی اور اخبار کو حاصل نہیں ہوئی۔

بجز تفسیر القرآن مولانا آزاد کی اور کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ وہ مضامین جو "الہلال" میں نکلتے رہے وہی آپ کی انشاپردازی کو مسلّم کرتے ہیں۔ آپ کی زبان نہایت شیریں، صاف اور رواں ہوتی ہے۔ آپ کے طولانی جملوں میں توازن اور تسلسل لطف پیدا کر دیتا ہے۔ خیالات چونکہ سلجھے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے عبارت بھی سلجھی ہوئی اور مربوط ہوتی ہے۔ اور عام طور پر حشو و زوائد سے پاک۔

مولانا کو عربی الفاظ اور فارسی تراکیب کا خاص شوق ہے لیکن نرا شوق ہی نہیں بلکہ آپ ان کو نہایت سلیقہ اور اُستادی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں علمی اور فلسفیانہ عمق ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مفہوم کو نہایت سہولت کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور پھر اس طرح کہ نہایت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

مولانا کی قوت گویائی آجکل ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ آپ کی تقریر عالمانہ اور ادیبانہ ہوتی ہے۔ فصیح و بلیغ زبان کے علاوہ بیان اس قدر سُلجھا ہوا ہوتا ہے کہ لفظ لفظ میں تاثیر ہوتی ہے اور مطلب و مدعا اس طرح واضح ہوتا چلا جاتا ہے کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں تھا"۔ یہی خطیبانہ انداز آپ کی تحریر میں بھی نمایاں ہے۔ جوشِ عمل آپ کے جملے جملے سے ٹپکتا ہے۔ آپ کے مضامین زیادہ تر سیاسی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں جن کے لئے صداقت اور جوش نہایت ضروری ہے اور یہ صفات اُن کی تحریر میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

مولانا آزاد کا مطالعہ قرآن بہت وسیع ہے۔ قرآن کی آئتیں نہایت بے تکلفی اور برجستگی کے ساتھ آپ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ تفسیر القرآن آپ کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔ یہاں ہمیں اُس کی زبان اور طرزِ بیان سے تعلق ہے۔ تفسیر کے متعلق بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ورنہ اُس میں بھی بہت خوبیاں ہیں۔ زبان اور طرزِ بیان میں جو مولانا نے کمال دکھایا ہے وہ قابل صد ہزار ستائش ہے۔ تفسیر کی زبان نسبتاً آسان اور عام فہم ہے۔ ربوبیت جیسے وسیع اور پیچیدہ مسئلہ کو آپ نے اِس اُستادی سے بیان کیا ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ باوجود اس کے ادبیت میں فرق نہیں آنے پایا ہے۔

اگرچہ "الہلال" نے اُردو ادب کو بالواسطہ و بلاواسطہ بہت فائدہ پہنچایا ہے تاہم خاکسار کی آرزو ہے کہ کاش مولانا آزاد کوئی مستقل ادبی کارنامہ تصنیف فرمائیں اور دنیائے اُردو کو زیر بارِ احسان کریں۔

---

**ظفر علی خاں**

مولانا ظفر علی خاں مشہور و معروف اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر، مصنف، انشاپرداز اور شاعر کی حیثیت سے سچی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے ترجمے "معرکۂ مذہب و سائنس" کو قبولیت عام حاصل ہو چکی ہے۔ اور آپ کی زباندانی اور انشاپردازی کے روبرو صاحب الرائے اصحاب سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں۔

مولانا موصوف کا قلم سیاسی، تمدنی، آئینی اُمور کے علاوہ سائنٹفک

مذہب اور شعر و شاعری میں بھی اسی بیباکی اور روانی سے تگ و دو کرتا ہے۔ معاشرتی اصلاح کے لئے آپ نے خود بھی مضامین لکھے ہیں اور مغربی مصنّفین کے خیالات کو بھی اُردو میں منتقل کیا ہے۔ آپ کی تصنیف "معاشرت" قابل قدر کارنامہ ہے۔ آپ کے ناول بھی بلند پایہ ہیں جن سے آپ کی نظر کی وسعت اور مطالعہ کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ناول خانگی زندگی کا نہایت سچا مرقع پیش کرتے ہیں۔

مولانا کی زبان مستند ہے۔ روزمرّہ و محاورات پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے۔ عربی الفاظ اور فارسی تراکیب کو چابک دست صناع کی طرح برتتے ہیں۔ اندازِ بیان میں برجستگی اور روانی خاص طور پر نمایاں ہے۔ عبارت پُرزور اور مؤثر ہوتی ہے۔

آپ کی متفرق نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جو بہت مختصر ہے۔ اس میں زیادہ تر سیاسی نظمیں ہیں جو ہر حیثیت سے قابل قدر ہیں۔

## ۳۔ مزاح نگارانِ اُردو

**تمہید** | انسان محض حیوانِ ناطق ہی نہیں ہے بلکہ ہنسنے ہنسانے والا جانور بھی ہے۔ جہاں متانت و سنجیدگی لوازم انسانیت ہیں وہاں "خندۂ دنداں نما" اور "تبسّم زیرِ لب" بھی نہایت ضروری ہیں۔ ان کے بغیر شاید کامیاب زندگی بسر ہی نہیں کی جا سکتی۔

ادب، مرقعِ حیات ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی متانت و سنجیدگی

کے دوش بدوش شوخی، ظرافت، طنز، مزاح کا عنصر موجود رہا ہے۔ بعض لوگوں نے دل کا بخار نکالنے کے لئے طنز کا پہلو اختیار کیا۔ بعض نے محض ہنسنے ہنسانے کے لئے زعفران زار تیار کیا لیکن بعض نے شوخی اور مزاح نگاری کو اصلاح کا آلۂ کار بنایا اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے کام لیا۔

شاعری میں مرزا رفیع سودا کی ہجوؤں کا ذکر ہو چکا ہے۔ آپ دل کا بخار نکالنے والوں میں سے ہیں۔ انشا، رنگین، جان صاحب محض ہنسنے ہنسانے والوں میں۔ اور حضرت اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی وہ ہیں جو شوخی، طنز اور مزاح سے اصلاحی کام لیتے ہیں۔

نثر میں مزاح نگاری کی ابتدا "اودھ پنچ" کے اجرا سے ہوئی۔ منشی سجاد حسین اور اُن کے ناولوں کا ذکر باب ۱۲ میں گزر چکا ہے۔ منشی صاحب اس انجمن میں بھی صدر نشین ہیں۔ اور اُن کے حاشیہ نشینوں میں یعنی اودھ پنچ" کے نامہ نگاروں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی کی شوخیوں نے "اودھ پنچ" کو زعفران زار بنا رکھا تھا۔ لیکن یہ رنگ قدیم تھا۔ اب زمانہ نیا ہے۔ ہر چیز نئی ہے۔ یہاں تک کہ مزاح نگاری بھی نئے نئے اسلوب سے جلوہ گر ہے۔

مغربی علوم نے علم و ادب کا رنگ بدل دیا۔ ادب کے ہر شعبے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مزاح نگاری نے بھی اپنی چولی بدلی۔ یہ رنگ علی گڑھ سے شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ملک کے گوشے گوشے میں

پھیل گیا۔ چونکہ ہرکس وناکس نے اس رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی، اس لیئے اس میں ادبی شان پیدا نہ ہوسکی۔ اِنے گِنے چند اصحاب ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے زبان اور ادب کو مزاح پر مقدم سمجھا اور ظرافت کی بیباکیوں کو مقتضیات انشا پردازی سے دبایا۔

**رشید احمد صدیقی** آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو ادب کے پروفیسر ہیں۔ آپ نے مزاح نگاری کی تاریخ تصنیف فرمائی ہے جو ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔

آپ کے مضامین میں شستہ ظرافت ہوتی ہے جو زیادہ تر رمز و کنایہ سے پیدا کی جاتی ہے۔ "چشمِ ساقی" کی طرح آپ کے "اشارے بہت لطیف" ہوتے ہیں۔ جن سے پڑھنے والا نہ کبھی "ہوشیار" ہوتا ہے نہ "بے خود"۔ خیر یہ تو محض اصغر صاحب کے ایک شعر کا تلازمہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ جس شخص کی تاریخی، سیاسی اور اخباری معلومات وسیع نہیں ہوتی وہ آپ کے مضامین کا منھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

آپ کے مضامین کی طرح آپ کی زبان بھی مشکل اور خاص فہم ہے۔ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب بکثرت استعمال کرتے ہیں لیکن اکثر انھیں الفاظ و تراکیب میں "موجِ تبسّم" پنہاں ہوتی ہے۔ ادبیت و صحت آپ کی عبارت کا جوہر ہے۔

**مرزا فرحت اللہ بیگ** آپ کی مزاح نگاری لطیف تبسّم پیدا کرسکتی ہے۔ آپ کے مضامین میں ادبیت جھلکتی ہے۔

زبان کی صحت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اور پستی اور عامیانہ پن سے گریز کرتے ہیں۔ آپ نے مزاح نگاری کے علاوہ ادبی مباحث پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر آپ اپنی شوخی طبیعت سے مجبور ہیں کہ وہاں بھی گل کھلائے بغیر نہ رہ سکی۔ آپ کو دہلی کی عامیانہ زبان اور روزمرہ پر کامل عبور حاصل ہے۔ اور انھیں مضامین میں موقع موقع سے سجاتے جاتے ہیں جس سے عجب لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

**عظیم بیگ چغتائی**

مزاحیہ افسانہ نگاری کے علاوہ آپ مصوری میں بھی کامل ہیں۔ آپ کے افسانوں میں پلاٹ کی دلکشی خاص چیز ہے۔ آپ کے اکثر افسانوں کا مقصد اصلاح رسوم ہوتا ہے۔ آپ شادی بیاہ، نکاح، طلاق اور پردہ کی رسوم میں اصلاحیں کرنا چاہتے ہیں اور یہی خواہش آپ کے افسانوں کی محرک ہوتی ہے۔ آپ کی مزاح نگاری کا دار و مدار پلاٹ پر ہوتا ہے۔ زبان کے بارے میں آپ ذرا بے پرواواقع ہوئے ہیں۔ آپ کی متعدد تصنیفات شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

**مُلّا رموزی**

آپ کی گلابی اُردو دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ (گلابی اُردو دریے ترتیب اُردو کا نام رکھ لیا گیا ہے۔ جیسے پُرانے زمانے میں قرآن شریف کا لفظی ترجمہ ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو باب ۱۲ ترجمہ از شاہ عبدالقادر صاحب)

مُلّا رموزی صاحب کے دل میں مذہب و قوم کا درد ہے۔ آپ

مذہب کو سرسبز اور قوم کو معراج ترقی پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے مضامین میں سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں۔ اور آپ کی مزاح نگاری کا دارومدار معاشرتی اور اخلاقی معاملات کی نکتہ چینی پر ہوتا ہے۔

# مُحسنین ادب اُردو

**تمہید** اُردو ادب کے موجودہ دَور کو اگر ادب لطیف کا دَور کہا جائے تو کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ دنیائے اُردو کا رُجحان زیادہ تر مختصر و مزاحیہ افسانہ کی طرف ہے۔ خصوصاً نوجوان اہلِ قلم تو اِسی ادب لطیف کو میدانِ عمل بنائے ہوئے ہیں۔ اور بجز دو چار ادبی رسائل کے اور کوئی رسالہ ایسا نہیں جو ادب لطیف سے گراں بار نہ ہو۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ دَور حاضرہ مسلّم الثبوت انشاپرداز حضرات سے قطعی خالی ہے۔ اِس دَور میں ناقدین کی بھی کثرت ہے لیکن افسوس کہ اُن میں معدودے چند اہلِ قلم حضرات تاریخ ادب میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ خاکسار یہاں اُن حضرات کا ذکر کرے گا جنھوں نے اپنی بے دریغ کوششوں سے اُردو ادب کو مالا مال ہی نہیں بلکہ اُردو زبان وادب کی روایات کے دوش بدوش اسلاف کے نام کو بھی روشن کیا ہے۔

## ۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی

آپ مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں۔ آپ نے مولانا موصوف کی وفات پر اُن کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین کو قائم و جاری رکھا۔ اور "سیرت النبی" کی تکمیل کی۔ فارسی و عربی کے عالم جیّد اور فاضل اجل ہیں۔ اور اُردو کے مسلم الثبوت انشا پرداز۔

آپ نے سیکڑوں مضامین ادبی، فلسفیانہ، مذہبی، تاریخی اور تنقیدی لکھے جو ملک کے مختلف رسائل خصوصاً "معارف" میں شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں آپ کی مستقل تصانیف میں "سیرت عائشہ"، "حیات مالک"، اور "خیام" خاص طور پر قابل قدر وستائش ہیں۔ "سیرت النبی" کی تیسری جلد چھ سو صفحوں میں مستقل لکھی ہے جس نے آپ کے نام نامی کو شہرت کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیا ہے۔

آپ انشا پردازی میں اپنے اُستاد مولانا شبلی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ جو لوگ مولانا شبلی کی طرز تحریر کے گرویدہ ہیں اُنھیں آپ کی تحریریں خاص لطف آتا ہے۔ آپ کی تحریر میں خاص پختگی اور ادبیت ہوتی ہے جس میں رنگینی کی بجائے خیالات کی ترتیب اور بیان کا زور اور عالمانہ متانت شگفتگی اور لطف پیدا کر دیتی ہے۔ آپ کی عبارت فارسی و عربی ادق الفاظ اور نامانوس تراکیب سے پاک ہوتی ہے۔ کہیں کہیں شوخی بھی جھلک دکھاتی ہے مگر نہایت لطیف، آپ مقرر بھی ہیں اور اچھے مقرر ہیں۔ اسی لئے آپ کی تحریر میں کہیں کہیں تقریر کا لطف آتا ہے اور عبارت کا زور بڑھ جاتا ہے۔

جن کو آپ کی ہمہ گیر طبیعت کے گوناگوں جلوے دیکھنے ہوں وہ آپ کے رسالہ "معارف" کے شذرات ملاحظہ کریں، جن میں ادبی، تنقیدی، تاریخی، مذہبی وغیرہ سب قسم کے مضامین بہترین ادبی شان کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

## مولانا عبدالماجد دریاآبادی

یوں تو آپ کے مضامین مختلف موضوعوں مثلاً سوانح عمری، تنقید وغیرہ پر اکثر نکلتے رہتے ہیں لیکن آپ کا خاص میدان فلسفہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اردو ادب میں اب تک فلسفہ پر بہت کم لکھا گیا تھا۔ لیکن مولانائے موصوف نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔

آپ کی مستقل کتابوں میں "فلسفۂ جذبات" اور "فلسفۂ اجتماع" اور ترجموں میں "مکالمات برکلے" نہایت مفید اور قابلِ قدر تصانیف ہیں۔

آپ کی زبان اور طرزِ بیان فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ لیکن آپ کا انداز مختلف موضوعات کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً فلسفہ میں آپ کا انداز عالمانہ ہوگا۔ فارسی و عربی کے ادق الفاظ و اصطلاحات استعمال ہوں گے۔ مگر عبارت میں سلاست و روانی قائم رہے گی۔ سوانح عمری یا ادبی تنقید میں آپ کا انداز بالکل بدل جائے گا۔ صفائی، سلاست اور شگفتگی بہت بڑھ جائے گی۔ عربی و

فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت بھی نہیں رہے گی ۔ اسی طرح موضوع کے مطابق انداز بیان اختیار کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے ۔ ہر رنگ میں زور ہوتا ہے اور ہر مقام پر آپ کی قدرت بیان کا ثبوت ملتا ہے ۔

ترجمے میں آپ نے کمال دکھایا ہے ۔ ترجمے پر تصنیف کا دھوکا ہوتا ہے ۔ آپ کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُردو اسلوب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ اُردو رُوزمرّہ و محاورہ کا پورا خیال رکھتے ہیں ۔ اور کہیں انگریزی جھلک آنے نہیں دیتے ۔ یہ صفت جس قدر قابلِ ستائش ہے اُسی قدر دشوار بھی ہے ۔ لیکن مولانائے موصوف نے اِسے اِس خوبی سے نباہا ہے کہ خاص و عام کو اپنی زباندانی اور انشاپردازی کا قائل کر لیا ہے ۔

**۳۔ مولوی عبدالحق** انجمن ترقّیٔ اُردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب اُردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ تاریخِ ادب کے صفحات پر زرّیں حروف میں لکھنے کے لائق ہیں آپ کو قدیم دکنی ادبیات سے جو دلچسپی ہے اُس کا اظہار اِس طرح ہوتا ہے ۔ کہ آپ آئے دن قدیم تصانیف مع مقدمات و حواشی شائع کرتے رہتے ہیں ۔ آپ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں لیکن متفرق مقدمے دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں جو نہایت مفید اور قابلِ قدر ہیں ۔ آپ نے ایک قواعد اُردو بھی لکھی ہے جو اپنی جدّت اور صحت کے لحاظ سے نہایت کارآمد کوشش ہے ۔

آپ کو ادب کے ہر شعبہ سے شغف ہے۔ اور آپ کی ہمہ گیر طبیعت کسی ادبی مسئلے پر بند نہیں۔ آپ رسالہ "اُردو" کے مدیر ہیں۔ جو دنیا کے ادب میں علمی و ادبی اضافہ کر رہا ہے۔

آپ کی زبان مستند اور اندازِ بیان صاف، سادہ، پُرزور اور پختہ ہے۔ تحریر میں شگفتگی بہت ہے اور مطلب کو اختصار کے ساتھ واضح کر دینے کی خاص صلاحیت ہے۔ روزمرّہ و محاورہ کی چاشنی سے عبارت کو پُرلطف بنا دیتے ہیں۔ ہندی الفاظ کا استعمال نہایت برجستہ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں فصاحت کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ غرض آپ موجودہ عہد میں صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔

---

۴۔ سید غلام محی الدین قادری زورؔ

آپ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں اُردو زبان و ادب کے پروفیسر ہیں۔

جس قدر آپ نوعمر و نوجوان ہیں اُسی قدر آپ نے اُردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمات انجام دی ہیں۔

ذیل کی تصانیف آپ کی خدمات کو مسلّم کرتی ہیں:۔ "روحِ تنقید"۔ "تنقیدی مقالات"۔ "شہ پارے"۔ "اُردو کے اسالیب بیان" اور "ہندوستانی لسانیات"۔

آپ انگریزی تنقید و ادب کو اپنا نصب عین سمجھتے ہیں اور انھیں سرچشموں سے اُردو کی آبیاری کرنا چاہتے ہیں۔ اصول تنقید پر اُردو میں

کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ چنانچہ آپ نے مغربی ماہرین فن کے نقش قدم پر چل کر "روح تنقید" تصنیف فرمائی۔ اور پھر اُن اصول کو عملی طور پر برت کر دکھایا۔ "تنقیدی مقالات" اسی عملی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اُردو زبان و ادب کی خدمات کے لحاظ سے زورؔ صاحب کا جو مرتبہ ہے اُس میں خاکسار کو کچھ کلام نہیں۔ لیکن اُن کی زبان اور طرزِ بیان میں ابھی پُختگی نہیں پائی جاتی۔ حیدرآبادی زبان کا اثر آپ کی اُردو پر کافی ہے اور آپ کے طرز بیان سے انگریزیت بھی ٹپکتی ہے۔ سلاست اور ہمواری سے بھی آپ کی تحریر عاری ہو جاتی ہے۔ لیکن آپ کے ذوقِ تصنیف و تالیف سے توقع ہے کہ بہت جلد یہ خامیاں رفع ہو جائیں گی۔

## تبصرہ

اُردو نثر نگاری کا آخری دَور گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہے۔ اس انجمن نے ہمہ گیر طبیعت پائی ہے۔ جہاں افسانہ نگار رونق افروز ہیں، وہیں شوخ طبع بھی موجود ہیں۔ بڑے بڑے محسنین زبان ایک طرف بیٹھے ہیں تو دوسری طرف اُن کے کارناموں پر تنقید کرنے والے بھی مستعد ہیں۔ تحقیق و تجسس کرنے والوں کی بھی ایک جماعت حاضر ہے۔ غرض مغربی علوم و فنون کا پورا پورا اثر اس دَور کے مصنفین نے قبول کر لیا ہے۔

اگرچہ خاکسار نے ڈرامے کا ذکر نہیں کیا لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اُردو ڈرامہ سے محروم ہے۔ آغا حشر، منشی رحمت علی، منشی ابراہیم محشر وغیرہم نے

بہت سے ڈرامے لکھے۔ کچھ خود تصنیف کئے کچھ انگریزی سے ترجمہ کئے۔ لیکن افسوس کہ اِن ڈراموں کو اُردو ادب میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اب تک جتنے ڈرامے لکھے گئے وہ محض تجارتی اصول پر لکھے گئے۔ اُن میں ادبیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بعض ڈرامے ادبی نقطۂ نظر سے بھی لکھے گئے لیکن وہ اسٹیج کے کام کے نہیں تھے۔ اس لئے شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ غرض ناچیز کی رائے میں اُردو نے ڈرامہ میں کوئی خاص کارنامہ پیدا نہیں کیا اور اِسی لئے خاکسار نے تاریخ ادب میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکالی۔ فی زمانہ سینما نے تھیٹر کے زور کو توڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ نویسی کی طرف سے توجہ ہٹتی جاتی ہے۔

اس دَور میں سب سے زیادہ کامیابی مختصر افسانہ کو حاصل ہوئی اور ابتدا ہی سے اس نے کمال حاصل کر لیا۔ لیکن ہمیں محسنینِ ادب کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے جن کی بیدریغ کوششوں سے ادب اُردو ترقی کر رہا ہے۔ یہ اُن ہی حضرات کی برکت ہے کہ اُردو کسی قدر اپنی اصلی حالت پر نظر آتی ہے۔ ورنہ فی زمانہ انگریزی نما اُردو کا اس قدر زور ہوتا جاتا ہے کہ مستقبل کی تاریکی بھیانک نظر آتی ہے۔

چونکہ دَور حاضرہ ہنوز اپنے وجود کے منازل طے کر رہا ہے۔ لہٰذا اس پر عمیق تبصرہ کرنا قبل از وقت ہوگا۔ اس وقت تک جو کچھ اس دَور نے کر دکھایا ہے اُس کا جائزہ لیتے ہوئے اِتنا کہنے میں باک نہیں کہ گزشتہ ادوار سے ابھی یہ

دور بہت پیچھے ہے۔ اگرچہ اس دور میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسی زبردست ہستیاں موجود ہیں لیکن افسوس کہ اب تک اس دور میں کوئی آزاد، حالی، شبلی، سرسید پیدا نہیں ہوا اور نہ مستقبل قریب میں اُمید ہے۔

---

# خاتمہ

ہماری تاریخ ادب اُردو ۱۴۰۰ء سے شروع ہوتی ہے اور آج ۱۹۳۶ء ہے۔ اس پانسو چھتیس برس کی مختصر سی عمر میں اُردو ادب نے جو علمی اور ادبی ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ واضح ہو کہ ابتدائی دو ڈھائی سو برس ایسے ہیں جن میں رفتار ترقی بہت سست رہی ہے اور اس کی خاص وجہ فارسی کا غلبہ تھا۔ لیکن اُردو اپنی سست رفتاری اور کم مائیگی کے باوجود بھی فارسی کے مقابلے پر ڈٹی رہی۔ آخر ۱۸۳۵ء میں فتحیاب ہو کر ملک کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی یعنی دفاتر سرکار میں یہ زبان رائج ہو گئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا پہلا اخبار نکلا۔ اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو اُردو ادب کی کل ترقی یہی سو سوا سو سال کے اندر اندر ہوئی ہے۔

جون ۱۹۲۰ء کے "معارف" میں سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون بعنوان "انڈیا آفس لائبریری میں اُردو کا خزانہ" شائع ہوا تھا۔ اس میں سید صاحب موصوف فرماتے ہیں "مطبوعہ اُردو کتابوں کی اہمیت بھی

یہاں (یعنی انڈیا آفس لائبریری لندن میں) میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ الحمد للہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحے میں اُس کی فہرست تمام ہوئی ہے۔ یہ فہرست سنہ ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب ہوا کہ اُردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی ......"۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء سے پہلے ادب اُردو کس قدر ترقی کر چکا تھا یعنی علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الٰہیات اور متفرق موضوعات پر اس قدر کتابیں لکھی جا چکی تھیں کہ ان کی فہرست تین سو صفحات میں تمام ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد میدانِ ادب میں جس سرگرمی کا اظہار کیا گیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر جملہ مطبوعہ کتب کی فہرست تیار کی جائے تو غالباً پانسو صفحات میں ختم ہوگی۔

موجودہ عہد میں اُردو ادب کا یہ حال ہے کہ صرف برٹش انڈیا میں دو سو سے زیادہ رسالے اور اخبار نکلتے ہیں اور ہر سال کم از کم چار سو کتابیں مختلف مضامین پر شائع ہوتی ہیں۔

دہلی سوسائٹی (سنہ ۱۸۴۰ء)، فورٹ ولیم کالج، سائنٹفک سوسائٹی (سنہ ۱۸۶۴ء) وغیرہ سے قطع نظر کر کے عہد حاضرہ میں متعدد انجمنیں اور ادارے قائم ہیں جو دن رات ادب اُردو کی ترقی میں سرگرم و کوشاں ہیں۔ ان میں سے چند مشہور و معروف انجمنوں اور اداروں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد)۔ اس انجمن نے اب تک علم الحیوانات، علم طبقات الارض، علم النفس، علم نباتات، علم معاشرت، تاریخ اور ادب میں متعدد بیش بہا کتابیں شائع کی ہیں۔ یہی انجمن "اُردو" نامی سہ ماہی رسالہ نکالتی ہے جو ادبی رسائل میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ دارالتراجم عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن)۔ اس ادارہ میں علم معیشت، تاریخ، منطق، اخلاقیات، نفسیات، مابعد الطبیعیات، طبیعیات، اقتصادیات، ریاضیات، علم الحیات، علم کیمیا وغیرہ علوم کی انگریزی کتابوں سے اُردو میں تالیف و ترجمہ کا کام ہوتا ہے۔ اِسی ادارہ میں وضع اصطلاحات علمیہ کے لئے بھی ایک شعبہ قائم ہے۔

۳۔ شبلی اکیڈیمی یعنی دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے مذہبی اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

۴۔ ہندستانی اکیڈیمی (الہ آباد)۔ اس میں علمی و ادبی مفید کتابیں اور ملک کے صاحبِ کمال حضرات کی تقریریں شائع ہوتی ہیں۔ ایک تماہی رسالہ "ہندستانی" کے نام سے نکلتا ہے جو ایک خاص اور معیاری رسالہ ہے۔

اُردو میں تخلیقی و طبع زاد کارناموں کو چھوڑ کر غیر زبانوں کے سرچشموں سے جو آبیاری ہوتی ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگریزی، یونانی، سنسکرت، فارسی وغیرہ زبانوں کی مایۂ ناز نظموں کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ نثر میں بھی غیر زبان کے مشہور مشہور مصنّفین کے کارنامے ترجمہ کر لئے گئے ہیں۔ شیکسپیئر کے زندۂ جاوید ڈراموں کو اُردو میں ترجمہ کر لیا گیا ہے۔ میدانِ کرشنا

اور بنگالی کے ڈرامے بھی اُردو میں آگئے ہیں۔ فلسفہ میں افلاطون، ارسطو، چانکیہ، لیبان، ہیگل، اسپنسر، جمیس وغیرہ کی شاہکار تصانیف ترجمہ کرلی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں ریاضی، جغرافیہ، معاشیات، سیاسیات، اقتصادیات، تاریخ وسیر، تعلیم، سائنس اور مذہب پر بے شمار کتابیں تالیف و ترجمہ کرلی گئی ہیں۔

اس ترقی کو دیکھ کر ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے بھی اُردو کی طرف نظر التفات سے دیکھا۔ چنانچہ بعض یونیورسٹیوں میں ایم۔اے تک اُردو پڑھائی جاتی ہے اور طلبہ کو ریسرچ کے لئے وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی نے سب سے اوّل شعبۂ اُردو قائم کیا۔ اس کے بعد آگرہ، لکھنؤ اور علی گڑھ یونیورسٹیوں نے بھی اُردو شعبے قائم کرکے ایم۔اے تک اُردو جاری کی۔ باقی یونیورسٹیاں بھی رفتہ رفتہ اُردو زبان و ادب کی اہمیت کا احساس کرتی جاتی ہیں۔

تمام شد

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام رمضان علی شاہ
چھپی